معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.

کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے.

جلد ۱۶۲ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۸ء عدد ۳

فہرست مضامین

شذرات

افغانستان میں مدت سے خون خرابہ جاری ہے، وہاں سے سوویٹ یونین جیسی عظیم الشان حکومت کی فوجوں کے انخلا میں مجاہدین کے جوشِ جہاد اور قوتِ ایمانی کے ساتھ امریکہ کی مالی و فوجی امداد بھی شامل ہوگئی تھی، لیکن امریکی حمایت میں حبِ علی کے بجائے بغض معاویہ کار فرما تھا، کیونکہ اس وقت اس کو اپنے سب سے بڑے اور طاقتور حریف سوویٹ یونین کو پسپا کرنا تھا، یہ کام انجام پاگیا اور سوویٹ یونین کی شکست و ہزیمت عمل میں آگئی تو امریکہ کا خاص نشانہ اسلام اور مسلمان ہوگئے جن کو نیست و نابود کردینے کے لیے اس نے اپنی پوری طاقت لگادی ہے، اس کے نزدیک اسلام ہی اب اس کا تن تنہا حریف و مد مقابل رہ گیا ہے، اس لیے جس مسلمان ملک کو ذرا بھی سر اٹھاتے یا اسلامی طرز حیات کی جانب مائل دیکھتا ہے، اس کے درپے ہوجاتا ہے اور اس کی قوت کو پاش پاش کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔

وہ گزشتہ بیس برسوں سے مسلمانوں کے استیصال کے لیے مسلسل تگ و دو کررہا ہے، علامہ خمینی کے اسلامی انقلاب کو ناکام اور ایران کو زیر کرنے کے لیے اس سے عراق کو لڑادیا۔ بعد از خرابی بسیار یہ بے مقصد و بے نتیجہ جنگ ختم ہوئی تو عراق سے کویت پر حملہ کرایا اور پھر کویت کو بچانے کے لیے سعودی عربیہ میں اپنی فوجیں اتار دیں جو اس مقدس سرزمین کو روندنے کے علاوہ ملک کی معیشت کے لیے بھی بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ عراق کو کچلنے اور تنگ کرنے کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہورہا ہے، لیبیا، الجزائر اور فلسطین سب ہی امریکہ کی چیرہ دستیوں سے چیخ اور کراہ رہے ہیں، شاہ فیصل اور جنرل ضیاء الحق کے خون ناحق سے بھی اس کے ہاتھ آلودہ ہیں، اب سوڈان اور اس افغانستان کو تختۂ مشق بنایا ہے جس کو سوویٹ یونین سے لڑنے کے لیے وہ خود ہی مہلک ہتھیار فراہم کرتا رہا ہے، پہلے جن کو مجاہدین کے نام سے موسوم کرتا رہا ہے اب ان ہی کو دہشت گرد قرار دے کر اپنے ظلم و تعدی کے لیے جواز پیدا کررہا ہے۔

تباہ و برباد افغانستان کو مجاہدین کے قبضے کے بعد بھی امن و امان نصیب نہیں ہوا، اس لیے کہ

مجاہدین میں خود ہی تخت و تاج کے لیے شدید کشمکش اور معرکہ آرائی شروع ہوگئی، وہ مختلف جماعتوں میں منقسم ہوکر ایک دوسرے کی گردنیں مارنے میں مصروف ہوگئے، ان کی محاذ آرائی کو پاکستان اور سعودی عربیہ کی مصالحانہ کوششیں بھی ختم نہیں کراسکیں اور ربانی اور حکمت یار نے حرم کعبہ میں ہونے والے معاہدے کا بھی پاس و لحاظ نہیں رکھا، اغیار کی سازشیں اور امریکہ کی ریشہ دوانیاں ان کے اختلافات بڑھاتی رہیں، چنانچہ جو علاقے روس سے جنگ میں تباہی سے بچ گئے تھے وہ بھی آپس کی خانہ جنگی سے برباد ہوگئے، ان ابتر حالات میں طالبان نمودار ہوئے اور دیکھتے دیکھتے وہ افغانستان پر قابض ہوگئے، ممکن ہے بعض طبقوں کو ان کی قدرے شدت پسندی اور حالات و مصالح کی عدم رعایت کا شکوہ ہو لیکن خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ طالبان نے شریعت کے قوانین نافذ کرکے افغانستان کو امن و سلامتی اور عدل و انصاف سے ہم کنار کردیا ہے، جنگی حالات کے باوجود لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا سدباب ہوتا جارہا ہے اور غذائی اشیا اور ضرورت کی دوسری چیزیں آسانی کے ساتھ وافر مقدار میں مل رہی ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اب لٹے پٹے افغانستان کو از سر نو اپنی تعمیر و ترقی کا موقع دیا جاتا لیکن طالبان کی بالادستی اور شریعتِ اسلامی کا نفاذ امریکہ کے لیے ناقابل برداشت ہے، نیروبی اور دارالسلام میں ہونے والے بم دھماکوں کو بہانہ بناکر اس نے میزائیل سے جو حملے کیے ہیں وہ اسکی انتہائی وحشت و درندگی کا ثبوت ہیں، بم دھماکے بہت قابل مذمت ہیں، مگر اس کی ذمہ داری بھی امریکہ اور اس جیسے اسلام دشمنوں ہی پر عائد ہوتی ہے جو بعض ناعاقبت اندیش اور خام ذہن کے مسلمانوں کو اشتعال دلاکر رحمت و سلامتی والے دینِ اسلام کی منافی حرکتوں کا مرتکب بنادیتے ہیں، جس کے بعد امریکہ اور دشمنانِ اسلام کو اس سے بڑی ناروا حرکت اور دہشت گردی کا موقع مل جاتا ہے، افسوس یہ ہے کہ امریکہ اس کھلی جارحیت اور دہشت گردی کی مذمت بعض اسلامی

ملکوں اور ہندوستان نے بھی جس کو اپنی امن پسندی اور غیر جانبداری کا دعویٰ ہے نہیں کی۔ سابق صدر ربانی کی "گل افشانیِ گفتار" بھی کم اذیت ناک نہیں ہے، اس موڑ پر طالبان اور ایران میں جنگ کا خطرہ پیدا ہو جانا بھی ملتِ اسلامیہ کی بدنصیبی ہے، دونوں کو صبر و تحمل سے کام لے کر اور مسلک و عقیدے کے اختلاف کو نظر انداز کر کے اسلامی اخوت کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور کشت و خوں ریزی کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے ورنہ وہ امریکہ و یورپ کے ملکوں کی مقصد برآری کا ذریعہ بنیں گے، افغانستان میں مستحکم حکومت کا قیام ضروری ہے، اس سے اور وسط ایشیا کی مسلم حکومتوں کے اتحاد سے امریکہ گھبرا اٹھا ہے کہ کہیں اس کے سرمایہ دارانہ نظام کا سفینہ غرق نہ ہو جائے، اگر ایران و طالبان نے یہ زریں موقع کھویا تو قدرت انہیں معاف نہیں کرے گی، کاش یہ صدائے بے نوا دونوں ملکوں کے سربراہوں تک پہنچ جاتی ع کہ بر درِ نزد شاہان زمنِ گدا پیامے۔

اترپردیش اردو اکادمی اور محکمہ ثقافت اترپردیش کے تعاون سے آزادیِ ہند کی گولڈن جبلی تقریبات کے سلسلے میں "اردو صحافت" پر ۱۶ اگست ۹۸ء کو اکادمی کے آڈیٹوریم میں ایک سمینار ہوا جس کی صدارت قومی آواز کے سابق مدیر جناب عشرت علی صدیقی نے کی اور دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ کے متعدد صحافیوں نے مقالے پڑھے، میرے مقالہ کا عنوان "اردو کے ادبی رسائل و جرائد کا ایک اہم مسئلہ۔ قارئین" تھا، دہلی سے آنے والوں میں انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم اور حاجی ادریس دہلوی بھی تھے۔ ۱۷ اگست کو گولڈن جبلی کی تقریب ہی کے سلسلے میں اکادمی نے ریاست کے ۵ صحافیوں کو اردو صحافت ایوارڈ دیا جو عموماً اخباروں کے اڈیٹروں کو ملا کرتا تھا، غالباً پہلی بار اترپردیش اردو اکادمی نے پانچ میں سے تین رسالوں کے مدیروں کو بھی یہ اعزاز ریاستی گورنر سورج بھان سنگھ کے ہاتھوں دلایا جن میں خاکسار کے علاوہ جناب اسلوب احمد انصاری مدیر سہ ماہی نقد و نظر اور جناب عابد سہیل سابق مدیر ماہنامہ کتاب بھی تھے۔ دونوں تقریبیں خوش اسلوبی سے انجام پائیں، اردو اکادمی کی موجودہ چیرپرسن ڈاکٹر شمیم رضوی بڑی مستعد اور کارگزار ہیں، توقع ہے کہ ان کی رہبری میں اکادمی اردو کے فروغ و ترقی کے لیے مفید اقدامات کرے گی۔

مقالات

عالمِ ربوبیت میں توحید شہودی کے جلوے
اور
اہلِ اسلام کی ذمہ داریاں

از مولانا شہاب الدین ندوی

(۳)

سائنس مطالعۂ ربوبیت کا نام ہے اس بحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ علم تکوین اور سائنس دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ کیونکہ دونوں کا موضوع ایک ہے۔ یعنی "تخلیقاتِ الٰہیہ" یا "موجوداتِ عالم"، چنانچہ سائنسی علوم میں جن چیزوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہ یا تو جمادات و سماوات ہیں یا نباتات و حیوانات۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوقات ہیں۔ لہٰذا سائنس کا دائرہ کار مخلوقاتِ الٰہی سے باہر نہیں ہے۔

چنانچہ سائنسی علوم میں موجوداتِ عالم کا مطالعہ مختلف حیثیتوں سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ جمادات کا مطالعہ جس علم کے تحت کیا جاتا ہے اس کا نام ارضیات (جیالوجی) ہے۔

۲۔ حیوانات و نباتات کا مطالعہ جس علم کے تحت کیا جاتا ہے اس کا نام حیاتیات (بیالوجی) ہے۔

۳۔ اور سماوات کا مطالعہ جس علم کے تحت کیا جاتا ہے اس کا نام فلکیات (اسٹرانمی) ہے۔

نیز ان تمام موجودات کا مطالعہ مجموعی اعتبار سے مزید دو علوم کے تحت کیا جاتا ہے۔

جو طبیعیات (فزکس) اور کیمیا (کیمسٹری) کہلاتے ہیں اور ان تمام علوم کے مجموعے کا نام "سائنس" ہے۔ لہذا سائنس کی تعریف لوگ جو بھی کریں مگر اسلامی نقطۂ نظر سے وہ اصلاً مطالعۂ ربوبیت کا نام ہے اور اسے اصطلاح میں "علم تکوین" یا "علم اسماء" یا "علم آیات" کہا جا سکتا ہے۔ ان سب کی حقیقت ایک ہی رہے گی اور یہ بھی واضح رہے کہ سائنس کے معنی علم کے ہیں۔ چنانچہ جدید عربی میں آج سائنس کو "علم" ہی کہا جاتا ہے۔ اور حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود قرآن حکیم نے بھی عالم مظاہر یا عالم فطرت کے لیے "علم" ہی کا لفظ اختیار کیا ہے۔ بطور مثال ملاحظہ ہو، ایک موقع پر متعدد مظاہر کائنات کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ	اللہ سے اس کے بندوں میں صرف
الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸)	علماء ہی ڈرتے ہیں۔

جیسا کہ گزر چکا اس علم کی تحقیق و تدوین کرنے اور اسے ترقی دینے والے مسلمان ہی تھے، گو مسلم حکومتوں کے زوال کے بعد اہلِ اسلام کا یہ علمی تفوق قائم نہ رہا۔ تاہم اہلِ اسلام ہی کی تحقیقات کی بدولت یورپ کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آئی۔ علمی اعتبار سے سقوط غرناطہ (اسپین) یورپ کے عروج اور مسلم حکومتوں کے زوال کا باعث بنا۔ اس حادثہ فاجعہ کے بعد پانچ سو سال سے مسلمانوں کا رشتہ علم سے پوری طرح کٹ کر رہ گیا ہے۔ مگر یہ ہمارا علم تھا جس کی بنیاد ہم نے قرآنِ عظیم کی سرپرستی اور رہنمائی میں ڈالی تھی اور اس کی ترقی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لہذا ہماری نشاۃ ثانیہ کے لیے اسے پھر سے اپنانا ہوگا۔ جب تک اس علم سے ہماری بیگانگی باقی رہے گی۔ احیائے دین بدستور ایک خوا[illegible]شاں بنا رہے گا۔

اہلِ اسلام کا تاریخی کارنامہ

اس بحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ اسلام نے علم تکوین یا سائنسی علوم کو خالص اپنے شرعی مقاصد کی خاطر ترقی دی تھی۔ مگر یہ علم اہل اسلام کی گرفت سے نکل کر سارے جہاں میں پھیل گیا۔ بلکہ درحقیقت مسلمانوں نے حد درجہ بے تعصبی اور وسعت قلبی کے ساتھ اس علم کی ترویج و اشاعت کی۔ چنانچہ سسلی (صقلیہ) قرطبہ اور غرناطہ (اسپین کے دو شہر) وغیرہ میں جہاں پر مسلمانوں کے علمی مراکز اس میدان میں سرگرم عمل تھے، ان میں یورپ کے لوگ بھی آکر اعلیٰ تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ جس طرح کہ آج مشرق کے لوگ مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ "نیا علم" پہلے یوروپ اور اس کے بعد ساری دنیا میں پھیل گیا اور آج وہ ترقی کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہے۔

علمی میدان میں اہلِ اسلام کی اس اولیت اور برتری کے بہت سے غیر متعصب مغربی فضلاء بھی معترف ہیں اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ ان کے اس کارنامے کو تسلیم کرتے ہیں کہ یوروپ کی نشاۃ ثانیہ مسلمانوں کے علمی کارناموں ہی کے باعث عمل میں آسکی ہے، جنھوں نے قدیم سائنس اور فلسفے کو دریافت کر کے ان میں خوب اضافہ کیا اور تجرباتی علوم کی داغ بیل ڈال کر اسے ترقی دی۔ چنانچہ بطور مثال فلپ کے حتی اپنی مشہور کتاب "ہسٹری آف دی عربس" میں تحریر کرتا ہے۔ "مسلم اسپین قرون وسطیٰ میں یوروپ کی ذہنی ارتقا کی تاریخ بنانے میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ آٹھویں اور تیرہویں صدی کے درمیان، جیسا کہ ہم اس سے پہلے ملاحظہ کر چکے ہیں عربی بولنے والے ہی پوری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار رہے ہیں۔ مزید برآں وہی قدیم سائنس اور فلسفہ کی بازیافت کا واسطہ بھی بنے۔ پھر ان علوم میں اضافہ کر کے

انہیں اس طور پر منتقل کیا کہ (انہی کے باعث) مغربی یورپ کی نشاۃ ثانیہ ممکن ہو سکی۔ اس پورے عمل میں عربی اسپین (اندلس) کا بہت نمایاں حصہ ہے۔

MOSIEM SPAIN WROTE ONE OF THE BRIGHTEST CHAPTERS IN THE INTELLECTUAL HISTORY OF MEDIEVAL EUROPE. BETWEEN THE MIDDLE OF THE EIGHTH AND THE BEGINNING OF THE THIRTEENTH CENTURISS, AS WE HAVE NOTED BEFORE, THE ARABIC-SPEAKING PEOPLES WERE THE MAIN BEARERS OF THE TORCH OF CULTURE AND CIVILIZATION THROUGHOUT THE WORLD. MOREOVER THEY WERE THE MEDIUM THROUGH WHICH ANCIENT SCIENCE AND PHILOSOPHY WERE RECOVERED. SUPPLEMENTED AND TRANSMITTED IN SUCH A WAY AS TO MAKE POSSIBLE THE RENAISSANCE OF WESTERN EUROPE. IN ALL THIS, ARABIC SPAIN HAD A LARGE SHARE[1]

واقعہ یہ ہے کہ یوروپ میں جدید تجربیت کا سب سے پہلا مفکر فرانس بیکن (۱۵۶۱-۱۶۲۶ء) تسلیم کیا جاتا ہے جس نے ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ فلسفہ تجربیت کا تصور پیش کرتے ہوئے سائنٹفک طریق تحقیق کی تحریک چلائی۔[2]

[1] PHILIP K. HITTI HISTORY OF THE ARABS 10TH EDITION THE MAC-MILLAN PRESS LTD, LONDON, 1977, P.557.

[2] دیکھئے 'فلسفۂ مذہب' از ایڈون اے برٹ، مترجم بشیر احمد ڈار، ص ۲۲۵، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۳ء۔

نیز یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یونانی فلاسفہ تجرباتی علوم سے ناآشنا ہونے کے باعث تسخیر کائنات کی بھنک بھی ان کے کانوں میں نہ پڑ سکی تھی۔ جیسا کہ حوالۂ سابق کا مصنف ایڈون برٹ تحریر کرتا ہے: "درحقیقت یونانی ذہن تسخیر کائنات کے تصور سے بالکل ناآشنا تھا اور اس لیے ان کے ہاں عقلیت کے نصب العین میں یہ شے شامل نہ تھی۔"[1]

اس اعتبار سے بیکن کی فکری تحریک کا آغاز سترہویں صدی سے ہوتا ہے۔ مگر اس کے برعکس اہلِ اسلام آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں یعنی بیکن سے سات آٹھ سو سال پہلے ہی تجرباتی سائنس کی بنیاد ڈال کر مختلف سائنسی علوم کی تدوین کر رہے تھے اور سائنسی تجربہ گاہیں اور رصدگاہیں قائم کرکے قرآنِ عظیم کی انقلابی تعلیم کے مطابق قدیم نظریات کو مشاہدہ اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ رہے تھے اور آزادانہ طور پر نئے نئے نظریات قائم کر رہے تھے۔ اس طرح مسلمانوں نے اپنے دور میں انقلابی اقدامات کرکے ایک نئے اور سنہرے دور کا آغاز کیا اور ایک نئی تاریخ بنائی اور اس راہ میں مسلم سائنسدانوں کے تحقیقی کارناموں کو اگر جمع کیا جائے تو اس سے ایک ضخیم کتاب وجود میں آ سکتی ہے اور اس کے جستہ جستہ نمونے ہمیں ان موضوعات پر لکھی گئی مستقل کتابوں کے علاوہ خود قدیم علماء کی تحریروں اور ان کی تصانیف میں بھی ملتے ہیں، خاص کر امام رازیؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کی تصانیف میں۔ اور ان میں بہت سے ایسے نظریات ملتے ہیں جو تحقیقات جدیدہ کے عین مطابق ہیں بلکہ مسلم دور کے سائنسی نظریات اور عصرِ جدید کی تحقیقات کا موازنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور کی بہت سی چیزیں "مسلم نظریات" کی کاربن کاپی ہیں اور یہ تمام نظریات ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں کہ

[1] حوالۂ مذکور، ص ۲۲۴

"تجرباتی حقایق" میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی، جو قرونِ وسطیٰ سے برابر متوارث چلے آرہے ہیں اور یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر تحقیقی کام کرنا بہت ضروری ہے تاکہ ہمارے دیندار طبقے کو سائنسی علوم کے معتبر ہونے کا یقین ہوسکے۔

جدید اکتشافات اور اصول دین واقعہ یہ ہے کہ ثابت شدہ حقایق کا انکار دین کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ بلکہ یہ چیز تشکیک اور دین سے دوری کا سبب بنتی ہے اور یہ بات شرعی وعقلی کسی بھی حیثیت سے جائز نہیں ہے۔ اس موضوع پر ہمارے قدیم اہلِ نظر علماء اور ائمۂ کرام نے مبسوط بحث کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں امام غزالی (م ۵۰۵ھ) نے ایک بنیادی اصول یہ بیان کیا ہے کہ وہ ثابت شدہ حقایق جو اصول دین (دینی عقائد) سے (نفیاً یا اثباتاً) متصادم نہ ہوں ان میں (اہل علم یا معقولیت پسندوں سے) جھگڑنا جائز نہیں ہے اور موصوف اس ذیل میں بطور مثال کسوف وخسوف کا تذکرہ کرتے ہوئے بالکل وہی حقایق پیش کیے ہیں جو جدید سائنس میں بھی تجرباتی نقطۂ نظر سے ثابت شدہ ہیں اور ان میں زمین کی گولائی کا نظریہ اور چاند کی روشنی کا سورج کی روشنی سے مستعار ہونے کا نظریہ بھی شامل ہے۔ نیز اس میں اس حقیقت کا انکشاف بھی موجود ہے کہ زمین چاروں طرف سے "آسمان" کو گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی کسی سہارے کے بغیر ٹھہری ہوئی ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید سائنس قدیم سائنس ہی کا چربہ ہے، جس نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں امام صاحب نے اب سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے تحریر کیا ہے کہ اصولِ دین کی جو بات فلاسفہ (سائنسدانوں) کے مذہب سے بالکل ٹکرانے والی نہ ہو اور وہ چیز انبیائے کرام کی تصدیق کی ضرورت میں بھی شامل نہ ہو، اس میں

ان سے جھگڑنا صحیح نہیں ہے۔ جیسے ان کا یہ کہنا کہ چاند گرہن کا مطلب چاند کی روشنی کا محو ہوجانا ہے، زمین کا چاند اور سورج کے درمیان حائل ہوجانے کی وجہ سے۔ کیونکہ چاند سورج کی روشنی سے استفادہ کرتا ہے اور زمین چونکہ کرّہ (گیند کی طرح گول) ہے، اور آسمان اس کا ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے، اس لیے جب چاند زمین کے سائے میں آجاتا ہے تو سورج کی روشنی اس سے منقطع ہوجاتی ہے۔ اسی طرح سورج گرہن کا مطلب چاند کا زمین اور سورج کے درمیان حائل ہوجانا ہے۔[1]

امام صاحب اس سلسلے میں مزید تحریر کرتے ہیں کہ: جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اس قسم کی چیزوں میں (اہل علم سے) مناظرہ کرنا دین کی کوئی خدمت ہے تو وہ ایک جرم کرتا ہے اور دین کے معاملے کو کمزور کرتا ہے، کیونکہ ان امور (کسوف وخسوف کی تحت) پر ہندسی اور حسابی دلائل قائم ہیں، جن کے بارے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی شخص ان کی تحقیق کرے تو ان کے وقت وغیرہ کی (پہلے ہی) خبر دے دیگا لہٰذا جب اس سے یہ کہا جائے کہ یہ بات "خلاف شرع" ہے تو وہ اس میں شک نہیں کرے گا بلکہ شریعت کے بارے میں شک میں پڑ جائیگا اس لحاظ سے شریعت کا ضرر جو اس کی صحیح طریقے سے نصرت نہیں کرسکتا اس شخص کے ضرر سے زیادہ ہے جو اپنے طریقے کے مطابق اس پر طعن کرتا ہے اور یہ بات اس کہاوت کے مطابق ہے؛ عاقل دشمن جاہل دوست سے زیادہ بہتر ہے[2]

امام صاحب کے اس بصیرت افروز بیان میں ان لوگوں کے لیے کئی عبرتیں موجود ہیں جو سائنسی علوم ومسائل کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان پر بے جا قسم کے

[1] تہافۃ الفلاسفۃ، ابو حامد غزالی، ص ۱۴۱، طبع جدید بیروت، ۱۹۹۰ء [2] ایضاً ص ۴۲۔

الزامات عائد کرکے ان کی صداقت میں شک کرتے ہیں اور کسی بھی چیز کی صداقت کو ماننے کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔ چنانچہ امام موصوف نے ایک ہزار سال پہلے جو کچھ بیان کیا ہے وہ جدید سائنسی تحقیقات کے عین مطابق ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر موصوف نے ہندسی اور حسابی دلائل کا تذکرہ کرتے ہوئے کسوف وخسوف کے بارے میں یہاں تک کہدیا ہے کہ اس علم کے ماہرین حساب لگاکر پہلے ہی پیش خبری بتادیتے ہیں کہ قدرت کے یہ مظاہر کب اور کتنے عرصے تک ظہور پذیر ہوں گے؟

جدید سائنس کی تصدیق آج ماہرینِ فلکیات نے فلکیاتی مظاہر کے بہت سے عجائب اور محیر العقول اسرار دریافت کرلیے ہیں اور اس بارے میں نہایت درجہ صحت کے ساتھ پیش گوئیاں کی جارہی ہیں۔ چنانچہ کسوف وخسوف ہی کو لیجیے، ان کے بارے میں سالہا سال پہلے ہی خبر دے دی جاتی ہے کہ یہ مظاہر ربوبیت کس سال، کس دن، کس وقت اور کس مقام پر رونما ہوں گے اور ان کا جلوہ کتنے عرصے تک رہے گا؟ اور اس میں کبھی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ماضی میں اس بارے میں نہایت درجہ صحت کے ساتھ بہت سی پیش گوئیاں کی جاچکی ہیں جو لفظ بہ لفظ پوری ہوچکیں۔ اب زمانۂ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے مکمل سورج گرہن کے بارے میں چند پیش گوئیاں ملاحظہ ہوں:

۱۔ مکمل سورج گرہن ۲۶ فروری ۱۹۹۸ء میں وسط بحر الکاہل اور کولمبیا وغیرہ میں دیکھا جاسکے گا۔

۲۔ ۱۱ر اگست ۱۹۹۹ء کو شمالی بحر اوقیانوس، یورپ اور مشرق وسطی میں واقع ہوگا۔

۳۔ ۲۱ر جون ۲۰۰۱ء کو بحر اوقیانوس اور جنوبی افریقہ میں رونما ہوگا۔

۴۔ ۴ر دسمبر ۲۰۰۱ء کو جنوبی افریقہ، بحیرۂ ہند اور آسٹریلیا میں ظہور پذیر ہوگا۔[1]

اس سلسلے میں فلکیاتی علوم میں کئی قسم کی معلومات موجود ہیں اور ان سب کی تفصیل کی اس موقع پر گنجایش نہیں ہے۔ لیکن اس بارے میں چاند گرہن اور سورج گرہن کے دو بنیادی ضوابط بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ اکثر سالوں میں چاند گرہن دو مرتبہ واقع ہوتا ہے۔ مگر بعض سالوں میں ایک یا تین مرتبہ ہوتا ہے اور کسی سال یہ بالکل نہیں ہوتا۔

۲۔ سورج گرہن (جزئی یا مکمل طور پر) ہر سال دو سے پانچ مرتبہ ہوتا ہے۔ مگر پانچ مرتبہ استثنائی طور پر واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ مظہر قدرت ۱۹۳۵ء میں پانچ مرتبہ ظہور میں آیا تھا اور اب دوبارہ ۲۲۰۶ء میں پانچ مرتبہ نمودار ہوگا۔ ایک صدی میں مکمل سورج گرہن ۶۶ مرتبہ واقع ہوتا ہے۔[2]

IN MOST CALENDAR YEARS THERE ARE TWO LUNAR ECLIPSES; IN SOME YEARS ONE OR THREE OR NONE OCCUR. SOLAR ECLIPSES OCCUR TWO TO FIVE TIMES A YEARS FIVE BEING EXCEPTIONAL: THERE WERE FIVE IN 1935 AND WILL BE AGAIN IN 2206. THE AVERAGE NUMBER OF TOTAL SOLAR ECLIPSES IN A CENTURY IS 66 FOR THE EARTH AS A WHOLE.

---

[1] ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا، ۵۴/۶، مطبوعہ لندن ۱۹۹۶ء

[2] ENCYCLOPAEDIA BRIT-UNNICA, 1983, VOL. 6, P. 190.

کارساز عالم کی حساب دانی

آفتاب و ماہتاب کے یہ وہ انتہائی دقیق اور منظم ضوابط ہیں جو اللہ تعالیٰ کی "حساب دانی" کا مظہر ہیں اور ان ضوابط میں سیکڑوں سال گزر جانے کے باوجود ایک منٹ کا بھی فرق نہیں آسکتا۔ کیا ایسا نفیس اور بے داغ نظام بغیر کسی خالق و موجد اور ناظم و نگراں کے خود بخود وجود میں آسکتا ہے؟ چنانچہ حسب ذیل آیات میں ربوبیت کے انہی تمام نظاموں کا مطالعہ کرنے اور "آسمانی" اسرار و عجائب کا مشاہدہ کرنے پر زور دیا گیا ہے:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝

(رحمان: ۵-۸)

سورج اور چاند ایک حساب سے (چل رہے) ہیں۔ درخت اور بیلیں (بے تنے کے درخت) (اپنے پروردگار کے حضور میں) سربسجود ہیں۔ اس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس میں ایک میزان (ہر ایک کا اپنا اپنا طبیعی ضابطہ) رکھ دیا اور (ہر ایک کو حکم دیا کہ) کوئی بھی (اپنے مقررہ) ضابطہ سے تجاوز نہ کرے۔

اس موقع پر دو زمین اور دو آسمان مظاہر کی طرف توجہ مبذول کرا کے یہ جتا دیا گیا ہے کہ زمین سے آسمان تک تمام مظاہر ربوبیت ایک ہی "میزانی ضابطہ" میں بندھے ہوئے ہیں اور کوئی بھی خدا کی مقرر کردہ "حد" سے باہر نکل نہیں سکتا اور اس اعتبار سے چاند اور سورج بھی اپنے مقررہ حساب کے مطابق چل رہے ہیں، جس کی بدولت مقررہ وقت پر

ان کا کسوف و خسوف واقع ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ نفیس ترین ضابطہ ان کے لیے مقرر نہ کرتا تو ان میں نظم وضبط کی پابندی ممکن نہ ہوتی اور اس اصول کی وضاحت دیگر مقامات میں اس طرح کی گئی ہے:

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى۔

(زمر: ۵)

اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو (ضوابط میں جکڑ کر انہیں پوری طرح) رام کر لیا (چنانچہ ان دونوں میں سے ہر ایک) اپنے مقررہ وقت کے مطابق چل رہا ہے۔

لفظ "اَجَل" کے معنی مقررہ مدت کے ہیں[1] اور لفظ "مُسَمًّى" کے معنی بھی مقررہ و متعینہ کے ہیں۔ اس لحاظ سے اس میں ایک مزید تاکید پیدا ہوگئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ "وہ مدت جو بالکل مقررہ اور متعینہ ہو" اور اس معنی کی وضاحت کے لیے سورۂ رحمان والی آیت میں لفظ "حُسْبَان" لایا گیا ہے، جس میں "حساب" سے زیادہ تاکید اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی "بالکل صحیح حساب"۔ دیکھیے قرآنی حقائق اور کائناتی ضوابط میں کس قدر "مطابقت" پائی جا رہی ہے۔ چنانچہ "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" یعنی قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے، کے مطابق قرآنی الفاظ و معانی کی یہی وہ "آپسی وضاحت ہے" جسے بعض مواقع پر "تفصیل" اور بعض مواقع پر "تصریف" کہا گیا ہے اور اس طرح کی تفصیل و تصریف کے باعث "تبیاناً لکل شیء" (ہر چیز کی خوب وضاحت) کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اس طرح

---

[1] المفردات فی غرایب القرآن، راغب اصفہانی، ص ۶، بیروت۔

کسی بھی علم اور "مسئلہ" کی حقیقت قرآنی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی راہ میں قرآنِ عظیم کے یہ تین "پیمانے" ہیں، جن کو پیشِ نظر رکھنے کی وجہ سے مسائل حیات کھل جاتے ہیں۔ گویا کہ یہ پیمانے قرآنِ حکیم کے سربمہر خزانوں کے کھولنے کے لیے شاہ کلید یا "ماسٹر کی" کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ذریعہ تمام "بند ابواب" کو کھولا جا سکتا ہے۔

غرض انہی تمام خدائی ضوابط کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک مقام پر تصریح کی گئی ہے کہ ان مظاہرِ ربوبیت میں غور کرنے والوں کے لیے اللہ کی نشانیاں یعنی دلائلِ ربوبیت موجود ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ	اور اس نے تمہارے لیے دن رات
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ	اور چاند سورج کو رام کر دیا ہے۔
مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِیْ	اور ستارے بھی اسی کے حکم کے تابع
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ	ہیں۔ اس بات میں عقل والوں کے
(نحل: ۱۲)	لیے کافی نشانیاں موجود ہیں۔

اثباتِ ربوبیت اور یوم آخرت یہ قرآنِ حکیم کا ایک عمومی اندازِ بیان ہے کہ وہ متعدد مظاہر کا تذکرہ کرنے کے بعد کہہ دیتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے مظاہر میں عقل مندوں اور غور و فکر کرنے والوں کے لیے بہت سے "نشانہائے ربوبیت" موجود ہیں جو غافل انسانوں کے لیے خدائی اسباق و بصائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاکہ انسان ان مظاہرِ ربوبیت میں ودیعت شدہ نظاموں کو دیکھ کر چونک سکے اور خدا پرستی کا راستہ اختیار کر سکے۔

چنانچہ اوپر مذکور مظاہر میں غور و فکر کے باعث اولین طور پر یہ حقیقت ثابت

ہوتی ہے کہ اتنا ہمہ گیر اور منظم نظام بے خدا وجود میں نہیں آسکتا۔ بلکہ یقیناً ایک عظیم ہستی موجود ہوگی جو ان بڑے بڑے اجرام کا نظم و ضبط محیر العقول طریقے سے سنبھالے ہوئے ہے اور وہ کوئی معمولی قوت والی ہستی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان اربوں کھربوں ستاروں اور لاتعداد کہکشاؤں پر مشتمل عظیم الشان کائنات کا انتظام سنبھالنا کسی معمولی ہستی کا کام نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا لامحالہ طور پر وہ ایک لامحدود ہستی ہی ہو سکتی ہے اور یہی خدائے ذوالجلال ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشادِ باری ہے:

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَيُوْلِجُ	وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور
النَّهَارَ فِی الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ	دن کو رات میں اور اسی نے سورج اور
وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى	چاند کو رام کر رکھا ہے (چنانچہ) ہر ایک
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ	ایک مقررہ مدت کے لیے چل رہا ہے
(فاطر: ۱۳)	یہی ہے تمہارا رب اور اسی کے لیے
	ہے (اس کائنات کی) پوری بادشاہی۔

"اَجَلٌ مُّسَمًّى" کا ایک مفہوم تو وہ تھا جو اوپر بیان کیا گیا لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں اجرام ایک وقت مقررہ یعنی "یوم موعود" تک برابر چلتے رہیں گے اور یہ حقیقت حسب ذیل آیت کریمہ سے واضح ہوتی ہے:

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِیْ	اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر
لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ	کر رکھا ہے (چنانچہ ان دونوں میں سے)
الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ	ہر ایک ایک وقت مقررہ تک چلتا رہے گا
تُوْقِنُوْنَ۔ (رعد: ۲)	وہ معاملہ کی تدبیر کر رہا ہے اور اپنی

نشانیوں کو کھول کر بیان کر رہا ہے
تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین
کر سکو۔

تجرباتی سائنس ابن تیمیہ کی نظر میں

حاصل یہ کہ امام غزالیؒ کے دور میں سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں جو نظریات قائم تھے وہ آج تک برقرار ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور اس سلسلے میں قدیم سائنس دانوں کے علاوہ خود ہمارے اہل نظر علماء بھی ان حقایق سے بخوبی واقف تھے۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں سورج گرہن اور چاند گرہن کی بعض پیش گوئیوں کی تصدیق کرتے ہوئے انہیں ایک "حسابی ضابطہ" قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ سے ایک فتوے میں اس طرح پوچھا گیا کہ: "اہل تقویم کہتے ہیں کہ اس ماہ کی ۱۴ تاریخ کو چاند گرہن اور ۲۹ تاریخ کو سورج گرہن واقع ہوگا تو کیا اس کی (شرعاً) تصدیق کی جاسکتی ہے؟ اس کا جواب علامہ نے یہ دیا کہ خسوف و کسوف کے اوقات مقدر ہیں، جس طرح کہ طلوع ہلال کا وقت مقدر ہے اور یہ اسی طرح کا ضابطہ ہے جس طرح کہ اللہ نے رات دن اور موسم گرما و سرما کا ضابطہ مقرر کیا ہے۔ نیز چاند اور سورج کا چلنا بھی اسی طرح کا ضابطہ ہے[1]

نیز ایک دوسرے موقع پر تحریر کرتے ہیں کہ سورج گرہن مہینہ کے آخر میں چاند کے چھپ جانے کے موقع پر ہوتا ہے اور چاند گرہن تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں رات کو یعنی "بدر کی راتوں" میں ہوتا ہے (کتاب الرد علی المنطقیین، ص ۲۷۲، مطبوعہ لاہور)

بات صرف کسوف و خسوف ہی کی نہیں بلکہ ہمارے قدیم علماء کی تحریروں میں ایسے

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۴/ ۲۵۴، مطبوعہ دار الافتاء ریاض۔

بے شمار حقایق مذکور ہیں جو جدید ترین سائنسی تحقیقات کے عین مطابق ہیں، جن کے ملاحظہ سے یہ حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مشاہداتی و تجرباتی حقایق جو استقرائی نقطہ نظر سے ثابت شدہ ہوں وہ کبھی نہیں بدلتے۔ لہذا ہمارے دیندار طبقے میں سائنسی علوم کی "تغیر پذیری" کا جو رونا رویا جاتا ہے وہ ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تجرباتی حقایق کا انکار دین کی کوئی خدمت نہیں بلکہ اس سے تشکیک اور بے دینی کو بڑھاوا ملتا ہے۔

تجرباتی حقایق کا انکار یونان کے بہت سے فلاسفہ اور خاص کر طبقۂ سوفسطائیہ کا طریق کار تھا جن کا رد شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے مدلل طور پر کیا ہے اور یونانی منطق کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہی "کتاب الرد علی المنطقیین" ہے۔

چنانچہ اس معرکۃ الآرا کتاب میں موصوف نے اسباب و علل کی کارفرمائی کا عقلی و شرعی دونوں حیثیتوں سے اثبات کرتے ہوئے خاص کر تجرباتی حقایق کا انکار کرنے والوں کا رد و ابطال کیا ہے اور تجرباتی حقایق کی قطعیت و یقینیت پر بصیرت افروز دلائل پیش کیے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ "مجربات" یعنی تجرباتی امور حواس خمسہ اور عقل سے حاصل ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں قرآن عظیم کی ایک آیت سے بھی استدلال کیا ہے جو یہ ہے:

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا
یقیناً سمع و بصر (یعنی حواس) اور فواد (یعنی عقل) سے باز پرس کی جائے گی۔
(بنی اسرائیل: ۳۶)

علامہ کے افکار کا خلاصہ یہ ہے:

۱- اہل منطق متواترات اور مجربات (تجربہ شدہ یا آزمودہ امور) کو قابل استدلال نہیں سمجھتے جو باطل ہے۔

۲۔ مجربات یا آزمودہ امور حواس اور عقل کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

۳۔ تجربہ نظر (مشاہدہ) اعتبار (جانچ پڑتال) اور تدبر سے حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ طبی امور و مسائل بھی تجربات ہی کے ذریعہ طے کیے جاتے ہیں۔

۵۔ قیاس شرعی کی بنیاد بھی مجربات ہی پر ہے جس میں "سبر و تقسیم" کے ذریعہ عمل کیا جاتا ہے (اور اسے منطق کی اصطلاح میں قیاس تمثیل کہتے ہیں)۔

۶۔ یہ تمام امور و مسائل اسباب و علل کے تابع ہیں۔

۷۔ جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک اسباب و علل معتبر ہیں۔

۸۔ یہی حال متواتر چیزوں کا بھی ہے، جیسے مکہ مکرمہ کے وجود کی خبر، یا مشہور شہروں کا وجود، یا سمندروں کا وجود، جن کو بعض لوگوں نے دیکھا ہے اور بعض نے نہیں دیکھا ہے، مگر جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے وہ ان چیزوں کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس سے متواترات کا انکار لازم آئے گا[1]۔

ابن تیمیہ کا ایک عظیم سائنسی اصول

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے اس موقع پر جو اصول و کلیات بیان کیے ہیں وہ انتہائی دقت نظر، باریک بینی اور استقرار پر مبنی ہیں اور یہ اصول علامہ موصوف نے ساتویں یا آٹھویں صدی ہجری میں یعنی اب سے تقریباً سات سو سال پہلے بیان کیے ہیں اور ان کے ملاحظہ سے جہاں ایک طرف یونانی منطق و فلسفے کا ابطال ہوتا ہے جو تجربات و مشاہدات کو قابل حجت نہیں مانتے تھے تو دوسری طرف عقل و شرع کی روشنی میں یہ ایسے عظیم اور رہنما اصول نظر آتے ہیں جن پر جدید سائنس کی پوری بنیاد ہے۔

---

[1] خلاصہ از کتاب الرد علی المنطقیین، ص ۹۲-۹۵، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۸ء۔

چنانچہ علامہ نے اس موقع پر ایک ایسا قاعدۂ کلیہ بھی بیان کر دیا ہے جو ایک عظیم ترین سائنسی اصول ہے۔ جس کی بنیاد پر جدید سے جدید تر تمام سائنسی انکشافات ظہور میں آرہے ہیں۔ اسی قیمتی اصول پر جدید سائنس کی پوری عمارت کھڑی ہے اور جدید سائنس مادی اشیاء میں غور و خوض کر کے آج جو بھی چیزیں دریافت کر رہی ہے وہ اسی عظیم اصول کے ماتحت ہے اور یہ اصول تجرباتی سائنس کی اصل بنیاد اور تحقیقات جدیدہ کی جان ہے اور اس بحث سے صاف ظاہر ہوگا کہ اس اصول کو دریافت کرنے والے مسلمان سائنس داں تھے، جس سے یورپ سترہویں صدی عیسوی میں یعنی اب سے تقریباً چار سو سال پہلے فرانسس بیکن کے ذریعہ واقف ہوا۔ اس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے اور اس بحث سے یہ بھی بخوبی ثابت ہوگا کہ مسلمان تجرباتی سائنس میں یورپ کے استاد ہیں۔ اگر اہلِ اسلام نے اپنے دور میں تجرباتی سائنس کی بنیاد نہ ڈالی ہوتی تو مغربی ممالک کو اس میدان میں موجودہ ترقی تک پہنچنے میں مزید کئی صدیاں لگ جاتیں۔

غرض علامہ موصوف نے اس سلسلے میں سب سے پہلے تجرباتی امور کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک وہ تجربہ جو انسان کی قدرت اور اس کی گرفت میں ہو اور دوسرا وہ تجربہ جو اس کی گرفت میں نہ ہو اور ان دونوں ہی میں حواس اور عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ قسم اول انسانی افعال ہیں، جیسے کھانا، پینا اور دوا استعمال کرنا وغیرہ[1]۔ اور قسم ثانی کی مثال چاند کا

---

[1] چنانچہ ان افعال کے جو اثرات اور نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ اسباب و علل کے تابع ہونے کی بنا پر تجرباتی ہوتے ہیں۔ مثلاً کھانا ایک سبب ہے، جو بھوک مٹانے کا باعث ہے، پانی پینا ایک علت ہے جس کا معلول پیاس مٹنا ہے اور دوا کھانا ایک سبب ہے جس کا مسبب بیماری دور ہونا ہے، و قس علیٰ ذلک۔

سورج کے تقابل کے اعتبار سے مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔[1]

چنانچہ قسم ثانی کے بارے میں موصوف نے ایک کلیہ اس طرح بیان کیا ہے کہ "یہ بات اس لیے ہے کہ "تجربہ" مشاہدہ، جانچ پڑتال اور غور وفکر سے حاصل ہوتا ہے، جیسے کوئی معین اثر کسی معین موثر کے ساتھ دائمی طور پر اثرانداز ہوتا ہے اور یہ بات مستقل "عادت" کے طور پر پائی جاتی ہے، خصوصاً جب کہ مناسب سبب کا شعور و ادراک کیا جائے۔[2]

اسلام کا ایک احسان یورپ پر

یہ کلیہ استقرائی منطق کی جان ہے جو علت و معلول کے ذریعہ قوانین قدرت دریافت کرنے کا نام ہے اور اسے منطق کی اصطلاح میں "برہان لمیّ" کہا جاتا ہے، جو علت کے ذریعہ معلول کا پتہ لگانے کا نام ہے اور سائنس کی تمام ایجادیں اور جملہ اکتشافات برہان لمی ہی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں "اسباب و علل" کی بعض سادہ مثالیں ملاحظہ ہوں: جہاں پر بادل ہوگا وہاں پر بارش آنے کا امکان بھی ہوگا، بغیر بادل کے بارش نہیں ہو سکتی۔ جہاں پر آگ جل رہی ہو وہاں پر دھواں نکلنا لازمی ہوگا، کیونکہ بغیر آگ کے دھواں نکل نہیں سکتا۔ جہاں پر دن موجود ہوگا وہاں پر سورج کی موجودگی لازمی ہوگی، کیونکہ بغیر سورج کے دن کا وجود ناممکن ہے۔

اسی طرح سورج جب زمین سے قریب ہو جاتا ہے تو موسم گرما آجاتا ہے اور جب

---

[1] اس سے مراد وہ امور ہیں جو نظام کائنات سے تعلق رکھتے ہوں اور ان میں انسانی کوششوں کو کوئی دخل نہ ہو۔ قسم اول کو ذاتی تجربات اور قسم ثانی کو آفاقی تجربات بھی کہا جا سکتا ہے [2] کتاب مذکور ص ۹۳۔

دور چلا جاتا ہے تو موسم سرما کا ورود ہوتا ہے۔ اگر وہ مقررہ فاصلے (نوکروڑ پندرہ لاکھ میل) سے زیادہ قریب آجائے تو سارے حیوانات و نباتات جل کر خاک ہو سکتے ہیں۔

جب بارش ہوتی ہے تو زمین پر جھاڑ جھنکاڑ اگتے ہیں اور ہر طرف روئیدگی نمودار ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں زمین پر زندگی کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ حیوانی زندگی کا دار و مدار آکسیجن پر ہے اور بغیر آکسیجن کے کوئی بھی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا۔ جس جگہ زمین پر پانی ٹھہر جائے وہاں پر مچھر پیدا ہوتے ہیں، جن کے کاٹنے سے ملیریا پھیلتا ہے۔ جہاں پر گندگی اور غلاظتوں کے ڈھیر ہوں وہاں پر وبائی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ فرحت بخش ہواؤں سے طبیعت میں تر و تازگی پیدا ہوتی ہے۔ جاذب نظر مناظر کو دیکھ کر طبیعت جھوم اٹھتی ہے۔ گندہ پانی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔ جراثیم کے حملوں سے بچنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ دھوئیں میں کاربن مونو آکسائیڈ ہوتا ہے جو صحت کے لیے مضر ہے۔ کھانا پکانے کے لیے آگ جلانی پڑتی ہے اور آگ جلانے کے لیے ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے۔ موٹر چلانے کے لیے پٹرول یا ڈیزل ضروری ہے۔ گھر اور دفتر میں بلب روشن کرنے کے لیے بجلی یا برقی قوت درکار ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کو کام کرنے کے لیے ریڈیائی لہریں پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ ایک راکٹ کو چلانے کے لیے مختلف قسم کا سیال اور انتہائی درجہ شعلہ پذیر ایندھن استعمال کیا جاتا ہے تاکہ وہ کم سے کم وقت میں زمین کی قوت کشش کو توڑ کر مصنوعی سیارے کو خلاؤں میں پہنچا سکے۔

چونکہ بغیر ایندھن کے کوئی چیز جل نہیں سکتی جس کے نتیجے میں روشنی اور حرارت حاصل ہوتی ہے۔ لہذا تحقیق کے بعد دریافت کر لیا گیا کہ سورج اور دیگر ستاروں سے جو روشنی اور تپش حاصل ہو رہی ہے وہ دراصل ہائیڈروجن گیس جلنے کی بدولت ہے۔

چنانچہ ان اجرام سماوی میں ہائیڈروجن مسلسل جل جل کر ہیلیم (ایک عنصر) میں تبدیل ہورہی ہے اور اس اعتبار سے یہ اجرام قدرتی تھرمونکلیر پلانٹ ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سورج کی یہ ساری "توانائی" یعنی اس کی ہائیڈروجن (جو اس قدرتی چراغ کے لیے ایک تیل کا سا کام کررہی ہے) ایک وقت مقررہ پر ختم ہوجائے گی جو سورج کی "طبیعی موت" کے مترادف ہے اور پھر سورج کی موت ہمارے پورے نظام شمسی کی موت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جب سورج ہی نہیں رہے گا تو "حیات" اور اس کی ساری سرگرمیاں بھی ٹھپ ہوکر رہ جائیں گی یہ گویا کہ قیامت کی آمد آمد کا ایک اعلان ہوگا۔[1] اس اعتبار سے یہ پوری کائنات علل و معلولات کے مضبوط سلسلوں میں جکڑی ہوئی ہے اور دنیا کی کوئی بھی چیز اور کوئی بھی "طبیعی واقعہ" اسباب و علل سے آزاد نہیں ہے، چاہے وہ عناصر و جواہر کی دنیا ہو یا نظامہائے شمسی کی دنیا۔ گویا کہ پوری مادی کائنات ربوبیت کی زنجیروں میں بندھی ہوئی ہے اور اس کے پیروں میں "ربوبیت" کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور ان بندھنوں سے عالم مادی کی کوئی بھی چیز آزاد نہیں ہوسکتی۔ بالفاظ دیگر اس جہان رنگ و بو میں "انتشار" یا "لاقانونیت" کا کہیں نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ یہ وہ قوانین قدرت یا قوانین ربوبیت ہیں جن میں تبدیلی محال ہے، اِلّا یہ کہ کوئی "معجزہ" ظہور میں آجائے۔

اس اعتبار سے اسباب و علل کا مطالعہ دراصل قوانین قدرت یا قوانین ربوبیت کا مطالعہ ہے یعنی وہ قوانین جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی اس عالم طبیعی میں جاری وساری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حقیقت حال اور حقیقت واقعہ کا مطالعہ ہے، جس کے

---

[1] راقم السطور نے اس موضوع پر مفصل بحث اپنی دیگر تصانیف میں کی ہے، جو اس سلسلے کے قرآنی دعووں کی ایک سائنٹفک تصدیق ہے۔

باعث مظاہر عالم کے بارے میں تاریک خیالی اور ہر قسم کی بدعقیدگی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اشیائے عالم کے سائنٹفک مطالعہ سے توہمات پر کاری ضرب پڑتی ہے اور تاریک خیالی کے بجائے روشن فکری پیدا ہوتی ہے۔ سائنٹفک انداز فکر کے ذریعہ اشیائے عالم کے درمیان پائی جانے والی "علتیں" دریافت کرنا یا "طبیعی واقعات" کے اسباب و علل کا کھوج لگانا جہاں ایک طرف قدرت کے مخفی عقائد کا پتہ لگانا ہے تو دوسری طرف "غیر سائنٹفک" قسم کے بے بنیاد نظریات و مفروضات کا خاتمہ بھی ہے۔

بہرحال منطق جدید میں "ربط علیت" کی بڑی اہمیت ہے جو جدید سائنس کی منہاج اور اس کا طریقہ کار ہے۔ چنانچہ اہل اسلام نے دنیائے انسانیت کو جہاں ایک طرف تجرباتی سائنس اور ربط علیت کے "گر" سے آشنا کیا تو دوسری طرف توہمات اور تاریک خیالی کے جنگل سے بھی اسے آزاد کرایا۔ نتیجہ یہ کہ آج اقوام عالم اشیائے عالم میں جاری علل و اسباب کا پتہ لگا کر خدائے مہربان کی نعمتوں سے متمتع ہورہی ہیں اور مادہ کے باطنی اسرار کا مطالعہ کرکے نئے نئے جہانوں کی تلاش میں منہمک ہیں۔ ظاہر ہے کہ مادی اشیاء سے "لطف اندوزی" کا یہ سارا کریڈٹ اسلام ہی کو جاتا ہے، جس نے اسرار کائنات کا کھوج لگانے کی دعوت دے کر دراصل تسخیر کائنات کا دروازہ کھولا، اس اعتبار سے یہ دنیائے انسانیت کے لیے اسلام کا ایک بہت بڑا تحفہ اور اس کا ایک عظیم احسان ہے۔

مگر اس موقع پر یہ بھی یاد رہے کہ آج سائنس اور ٹکنالوجی پر چونکہ ملحدوں اور مادہ پرستوں کا قبضہ ہے اور وہ چند جنگ باز قوموں کے زیر سایہ کام کررہے ہیں۔ اس لیے ان کا رجحان تعمیر انسانیت کے بجائے تخریب انسانیت بھی نظر آتا ہے اور یہ رجحان

دراصل خدا فراموشی کا نتیجہ ہے جو سائنس اور کلیسا کی تاریخی کشمکش کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس موضوع پر راقم سطور نے اپنی دیگر تصنیفات میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے[1]۔

معقول و منقول میں بلا علم گفتگو

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس موقع پر جو سائنسی اصول و حقائق بیان کیے ہیں وہ اپنے دور میں شائع و ذائع سائنٹفک حقائق کی بنیاد ہی پر ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک عالم دین تھے نہ کہ سائنسداں۔ مگر اپنے دور کے "علوم جدیدہ" میں انتہائی بصیرت رکھتے تھے، اس بنا پر آپ جامع المعقول والمنقول تھے۔

غرض ان حقائق کے ملاحظہ سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں اس قسم کے حقائق مسلم معاشرہ میں مشہور و مقبول تھے اور اس سے علامہ موصوف کی حقیقت پسندی اور سلیم الطبعی کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اگرچہ منطق و فلسفے کے زبردست نقاد تھے، جنھوں نے "عقلی علوم" کے غلط مسائل کی صحیح اصولوں کے تحت دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ لیکن جہاں پر تجرباتی امور یا ثابت شدہ حقائق کی بات آتی ہے تو پوری فراخدلی اور وسعت قلبی کے ساتھ ان حقائق کی صحت تسلیم کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ بلکہ اس قسم کے حقائق کی صحت تسلیم نہ کرنے والوں پر زجر و توبیخ بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ علامہ نے ایک دوسرے موقع پر تحریر کیا ہے کہ: "بغیر علم کے کسی مسئلے میں گفتگو کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ جس طرح شرعی مسائل میں بغیر علم کے گفتگو ممنوع ہے اسی طرح

[1] دیکھئے میری تصنیف "اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں" اور "قرآن حکیم اور علم نباتات" وغیرہ۔

معقولات میں بھی بغیر علم کے بحث ممنوع ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں (اہل دین) نے اپنی ناقص عقلوں اور اپنے فاسد قیاسوں کے ذریعہ نصرت دین کا دعویٰ کر دیا۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف اتنا ہی ہو سکا کہ انھوں نے ملحدوں اور دین کے دشمنوں کو اور زیادہ جری بنا دیا۔ اس اعتبار سے وہ نہ تو اسلام ہی کی کوئی مدد کر سکے اور نہ اس کے دشمنوں ہی کو شکست دے سکے"[1]۔

تجرباتی امور اور قیاس و اجتہاد

پھر یہی نہیں بلکہ امام ابن تیمیہؒ نے اس موقع پر اپنی انتہائی بصیرت اور ژرف نگاہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تجرباتی حقائق کا دین و شریعت کے ساتھ ربط و تعلق بھی دکھایا ہے جو ان کی بیدار مغزی اور بصیرت و آگہی کا ایک اور ثبوت ہے۔ انھوں نے پچھلے صفحات میں مذکورہ اصول کے ضمن میں مزید صراحت کی ہے کہ قیاس شرعی "علت" دریافت کرنے کے لیے "دوران" اور "سبر و تقسیم"[2] کے ذریعہ اسی قسم کی مناسبت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یعنی مناسب علت دریافت کی جاتی ہے۔ اگر علت ظنی ہو تو حکم بھی ظنی ہوگا، ورنہ اگر وہ قطعی ہو تو حکم بھی قطعی ہوگا[3]۔

اس اعتبار سے تجرباتی امور و حقائق صرف دنیوی معاملات ہی کے لیے ضروری نہیں بلکہ وہ شرعی امور و مسائل میں بھی نہایت درجہ اہمیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے "اجتہاد" کے لیے ان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے۔ چنانچہ اجتہاد شریعت کے "اصول اربعہ" میں سے ایک ہے، جس پر نئے مسائل کی تخریج کا دارومدار ہے۔

لہذا جو لوگ دلیل و استدلال کے میدان میں تجرباتی امور اور تجرباتی سائنس کو

[1] کتاب الرد علی المنطقیین ص ۲۷۳ [2] دوران کو "طرد و عکس" اور سبر و تقسیم کو "تردید" بھی کہا جاتا ہے جو منطق کی اصطلاحیں ہیں [3] خلاصہ از حوالہ مذکور، ص ۹۳۔

نامعتبر قرار دیتے ہیں وہ ذرا غور تو کریں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہ بے شعوری میں سائنس یا سائنسی علوم کا نہیں بلکہ خود اجتہاد کا انکار کر رہے ہیں اور شریعت کے ایک اصل اصول کو ڈھا رہے ہیں، وہ اصل جس پر دین الٰہی کی بنیاد ہے اور جسے تسلیم کیے بغیر جدید مسائل کا حل شریعت کی روشنی میں نکالنا محال ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ تجرباتی امور و حقائق کو نامعتبر اور اجتہاد کو معتبر قرار دیتے ہیں وہ ایک زبردست قسم کے عقلی و فکری تضاد میں غلطاں و پیچاں دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اجتہاد کو معتبر مانتے ہیں تو انہیں تجرباتی امور و حقائق کو بھی معتبر ماننا پڑے گا۔ ورنہ بصورت دیگر انہیں قیاس و اجتہاد کے غیر معتبر ہونے کا اعلان کرنا پڑے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ تجرباتی امور کا دین و شریعت سے تعلق دو طرح سے ہے: ایک دلیل و استدلال کے میدان میں اور دوسرے قیاس و اجتہاد کے میدان میں۔ اول سے تمدنی و اجتماعی مسائل حل ہوتے ہیں اور خاص کر منکرین حق پر حجت قائم ہوتی ہے جب کہ دوم سے جدید شرعی مسائل کا حل قیاس و اجتہاد کے ذریعہ نکالا جاتا ہے۔

تجرباتی امور اور طبی مسائل علامہ ابن تیمیہؒ نے اس موقع پر مزید صراحت کی ہے کہ طبی امور و مسائل کا تعلق بھی تجرباتی حقائق سے ہے:

وھکذا القضایا العادیۃ من قضایا الطب وغیرھا ھی من ھذا الباب۔[1]

چنانچہ علاج و معالجہ کے لیے ایک طبیب یا ڈاکٹر جو دوائیاں تجویز کرتا ہے وہ

[1] خلاصہ از حوالۂ مذکور، ص ۹۳۔

"تجربات" ہی کی قبیل سے ہوتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علاج و معالجہ میں "اسباب و علل" کا کافی دخل ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے اور کھانا کھانے سے بھوک مٹتی ہے، اسی طرح زہر کھانے سے موت واقع ہو جاتی ہے کونین کے استعمال سے بخار زائل ہو جاتا ہے، جمال گوٹہ لینے سے دست آتے ہیں، شراب پینے سے نشہ پیدا ہوتا ہے، افیم کھانے سے بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف قسم کے پودوں اور جڑی بوٹیوں میں اللہ تعالیٰ نے انواع و اقسام کے خواص و تاثیرات رکھ دیے ہیں جو مختلف بیماریوں کے لیے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں اور یہ سارا سلسلہ بھی اسباب و علل ہی کے ماتحت ہے، جن سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اسے اس کائنات میں یکہ و تنہا نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ قدم قدم پر اس کی تمام ضروریات کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور کسی بھی چیز کی کمی آنے نہیں دی ہے، ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا اگر وجود نہ ہوتا تو پھر خدا کی خدائی پر حرف آسکتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جہان رنگ و بو بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ یہاں پر ہر سو اور ہر طرف حکمت تخلیق انتہائی نظم و ضبط اور منصوبہ بندی کا مظاہرہ دکھائی دے رہا ہے جو ایک عظیم اور برتر ہستی کی تخلیق و تنظیم اور تدبیر اور حسن انتظام کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مقدمہ نگاری

از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط۔ مہاراشٹر

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو کا اولین شعری و افسانوی ادب فارسی سے اور نقدِ ادب عربی سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔ اردو افسانوں کے قدیم ترین اعلیٰ نمونے چاہے وہ دکن کے ملا وجہی کی "سب رس" یا شمالی ہند کے میر امن دہلوی کی "باغ و بہار"۔ حیدر بخش حیدری کی "آرائش محفل" ہو یا نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق" سب فارسی کی خوشہ چینی کی بدولت منصہ وجود میں آئے ہیں۔ اس کے علی الرغم جب ہم اردو تنقید کے اولین نمونوں کو سامنے رکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں عربی نقد کی مکمل تقلید کی گئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی "آب حیات"، الطاف حسین حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری"، مولانا شبلی نعمانی کی "شعر العجم" اور "موازنۂ انیس و دبیر"، غالب کی تقاریر و خطوط کے تنقیدی نکات وغیرہ میں "نقد عرب" کے مروجہ اصولوں اور معانی و بیان کی تکنیکی باریکیوں کو بالراست اپنایا گیا ہے۔ پھر اردو کے وہ انشاپرداز و ادیب جو مدارس دینیہ سے فارغ التحصیل ہیں ان کی اردو نگارشات میں بھی عربی کلاسکی تنقیدی روایات کی جلوہ گری ہے۔ اردو کے شموسِ ستہ سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا نیاز فتح پوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حکیم عبدالحئی، مولانا عبدالسلام ندوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی،

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن، مولانا ضیاء الدین اصلاحی وغیرہ اکابرینِ ادب کا ایک ایسا مربوط سلسلہ ملتا ہے، جن کے یہاں تنقید ادب کے لیے نقد عرب کی کسوٹی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

عربی میں فن تنقید کی ابتداء یونانی تراجم کے زیرِ اثر ہوئی۔ البتہ ان تراجم سے بھی قبل عکاظ کے میلے میں سنائے جانے والے کلام پر کیے جانے والے اعتراضات میں تنقیدی اشاروں کی مبہم سی تشبیہ دکھائی دیتی ہے، مگر ارسطو کی بوطیقا POETICA کے عربی ترجمے اور اس کے ادبی مباحث نے ناقدینِ ادب العربیہ پر ایک خاص اثر ڈالا جس کے تحت ابن قتیبہ، ابن خلدون، قدامہ ابن جعفر، عبدالقاہر جرجانی، محمد بن سلام الجمحی، جاحظ، ابن رشیق اور ابوہلال وغیرہ نے ادبی تنقید پر مستقل کتابیں لکھیں جو عربی میں فن تنقید کے اولین شہ پاروں میں شمار ہوتی ہیں۔

عربی نقد میں مقدمہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عربی کے بعض مصنفین اور بعض کتابیں ان کے مقدموں کی وجہ سے معروف و مشہور ہوئے ہیں۔ مثلاً ابن خلدون اپنے مقدمہ کی وجہ سے عربی ادب میں معروف ہوئے ہیں تو ابن قتیبہ کی کتاب "ادب الکاتب" اس کے مقدمہ کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ اصناف سخن کے متعلق ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ تنقیدی نظریہ بن کر عربی ادب میں تسلیم کر لیا گیا اور اسی اساس پر بعد میں شعری تنقید کے اصول مرتب کیے گئے۔ انھوں نے اسالیب میں معنی کے بالمقابل الفاظ کی اہمیت کو پیش کیا اور کہا کہ "الفاظ معنی کے لیے بمنزلۂ قالب کے ہیں اور مثل ظروف کے۔ جس طرح سمندر سے پانی لے کر مختلف برتنوں میں بھر دیا جائے تو وہ پانی ایک ہی ہوگا، ظروف مختلف۔ کوئی سونے کا

تو کوئی چاندی کا۔ کوئی سیپ کا تو کوئی کانچ کا یا مٹی کا۔ اسی طرح معانی ایک ہی ہوتے ہیں مگر وہ الفاظ کے مختلف ظروف و قوالب میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور الفاظ جس قدر چست، موزوں اور موقع و محل کے مطابق ہوتے ہیں اسی قدر کلام اچھا، بہتر یا بہت ہی خوب سمجھا جاتا ہے۔" (بحوالہ برہان دہلی اکتوبر ۹، ص ۲۰۹)

ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" اور "الشعر والشعراء" بھی اپنے مقدموں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ سلام الجمحی کی "طبقات الشعرا"، قدامہ کی "نقد الشعراء" ابن رشیق کی "العمدة" کے نام بھی اسی ضمن میں لیے جاسکتے ہیں۔ عبداللہ ابن المعتز نے "کتاب البدیع" کے مقدمہ میں تو قرآن پاک کو تمام صنائع و بدائع کا منبع قرار دے کر "عہد اسلام کے شعراء کو بلاغت کے لحاظ سے اس لیے افضل بتایا کہ انہوں نے قرآن کے اسلوب لطافت سے فائدہ اٹھایا" (برہان اکتوبر ۹، ص ۲۱۳) عربی میں مقدمہ نگاری کی یہ روایت استاذ عبدالحمید العبادی اور ڈاکٹر طہٰ حسین سے ہوتی ہوئی دور حاضر کے ناقدین تک اپنی تمام تر لطافتوں، نزاکتوں اور اصولوں، ضابطوں کے ساتھ پہنچتی ہے اور تعجب خیز امر یہ ہے کہ باوجود انگریزی تنقید کی چہار دانگ عالم میں صدائے بازگشت کے عرب نقادوں نے اگرچہ کلی طور پر اس سے انحراف نہیں کیا تاہم اسلامی ادبی تنقید کو اس پر ضرور فوقیت دی۔ جس کی وجہ سے آج عربی تنقید اسلامی ادبی روایات کے زیر سایہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتی ہے۔

فارسی ادب میں بھی مقدمہ نگاری کی روایت ملتی ہے۔ حضرت امیر خسرو کی "غرۃ الکمال" اور "نہایت الکمال" کے مقدمے فارسی تنقید میں نہایت اہمیت کے

حامل ہیں۔ نعمت خاں عالی کے دواوین "نعمت عظمیٰ" اور "خوان نعمت" کے علاوہ ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کی کتاب "نورس" اور "گلزار ابراہیم" پر نورالدین ظہوری کے مقدمات بھی فارسی تنقید کے روشن سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

مقدمہ نگاری کی اس روایت کو اردو تنقید میں بڑا فروغ حاصل ہوا، بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اردو تنقید کی ابتدا ہی مقدمہ نگاری سے ہوئی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں جب اولین تنقید نگاروں کا نام لیا جاتا ہے تو مولانا الطاف حسین حالی "مقدمہ شعر و شاعری" کی بنا پر اور مولانا محمد حسین آزاد "آب حیات" کے مقدمے کی وجہ سے اردو نقد میں مشہور و معروف دکھائی دیتے ہیں۔ آل احمد سرور نے حالی کے متعلق صاف الفاظ میں کہا ہے کہ:

"وہ اردو کے پہلے نقاد ہیں اور پروفیسر کلیم الدین احمد بھی جو ان کے بہت زیادہ قائل نہیں اسے تسلیم کرتے ہیں کہ حالی اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔"

لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"حالی کی مشرقیت اور ان کی شرافت بعض اوقات معاصرین پر اظہار رائے میں انہیں ضرورت سے زیادہ نرم بنا دیتی تھی... مقدمے اور مقالات کے حالی میں یہی فرق ہے۔" (تنقید کیا ہے دہلی ۱۹۵۲ء ص ۱۹۲، ۳۵)

مولوی عبدالحق تو اردو ادب میں اردو کے قدیم سرمایہ کی دریافت اسکی تدوین و ترتیب اور اس کے بیش بہا شاہکاروں پر لکھے گئے مقدموں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ انہوں نے دکنی ادب پر جو تحقیقی کام کیا ہے وہ تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ دیتا ہے۔ ان کے مقدمات دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

مقدمہ نگاری کی یہ روایت آگے بڑھتے بڑھتے اردو ادب کے کم وبیش تمام اصناف پر چھاگئی، یہاں تک کہ بعض تکنیکی اور سائنٹفک علوم کی کتابوں پر بھی بیش بہا مقدمے لکھے گئے ہیں جن میں تحقیق کی گہرائی بھی پائی جاتی ہے اور تنقید کی وسیع النظری بھی۔ ایسی کتابوں میں "لسانیات" جیسے ادق مضمون کی کتاب "پنجاب میں اردو" پر محمود شیرانی کا مقدمہ، "تاریخ زبان اردو" پر پروفیسر مسعود حسین خاں کا مبسوط مقدمہ (جو کتابی صورت میں علاحدہ گیارہ بار شایع ہوا ہے) "اردو کی لسانی تشکیل" میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کا مقدمہ اور "نئی اردو قواعد" میں پروفیسر عصمت جاوید کا مقدمہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

مقدمہ نگاری دراصل کسی نئی کتاب کو پرکھنے کی ایک کسوٹی ہے جو اصناف تنقید میں تبصرہ نگاری اور دیباچہ/ تعارف سے زیادہ وسعت وعمق کی حامل ہوتی ہے۔ مقدمہ نگار کا ایک ایک جملہ (اگر شرافت، دیانت پر غالب نہ ہوجائے) قول فیصل ہوتا ہے۔ مقدمہ نگار کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ متعلقہ موضوع کے تمام گوشوں سے کلی طور پر واقف ہو یا کم از کم ان پر گہری نظر رکھتا ہو ورنہ وہ صحیح طور پر پرکھنے کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی نگارشات کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی مقدمہ نگاری میں متذکرہ اصولوں کو نہایت غیر جانبدارانہ انداز میں برتا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے مقدموں میں نفس نقد کی تمام باریکیوں کو دیانتداری سے اپنایا ہے۔ یوں بھی وہ ادب کی تنقید میں رواداری اور مروت کے قائل نہیں رہے۔ اس میدان میں نہ اقبال کی پروا کی نہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو چھوڑا۔ جب بھی موقع ملا نہایت

شرافت کے ساتھ ان اکابرین کی فنی وادبی غلطیوں کا برملا اظہار کردیا۔ کبھی ٹوکا، کبھی تنبیہ فرمادی۔ کبھی اشاروں کنایوں میں نشاندہی فرمادی۔ زیادہ تعریف یا بیجا تنقیص کے سید صاحب کبھی روادار نہیں رہے یہی وجہ ہے کہ ان کے مقدموں میں موضوع کو صحیح میزان پر تلا ہوا پاتے ہیں۔ نہ دوستوں کو حسرت نہ دشمنوں کو شکایت۔ "نپی تلی" بات ان کے مقدموں کا خاص انداز تھا۔ اس کی وجہ سے کوئی کتاب "آسمانی صحیفہ" نہیں بنی نہ کوئی "خزف پارہ"۔

سید صاحب کے مقدمے اتنے ٹھوس، جامع اور موضوع کو گرفت میں لیے ہوئے ہوتے ہیں کہ کتاب کے موضوع کے تمام گوشے چاہے وہ تاریخی نوعیت کے ہوں یا اصول بلاغت کے فلسفیانہ افکار کی باریکیوں پر محمول ہوں یا منطقیانہ رد وقدح کے، حکمت کے پہلو کے ہوں یا تفسیری نکات کے، شاعرانہ معنی آفرینی کے ہوں یا نثری اقدار کے، کتاب کے مطالعہ میں قاری کے ذہن میں کھلتے چلے جاتے ہیں۔ مقدمہ نگاری کا یہی فریضہ بھی ہوتا ہے کہ وہ قاری کی صحیح رہنمائی کرے۔ ان بنیادی اصولوں کے تحت جب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مقدموں کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ ایک طرف قارئین کو تاسف سے بچالیتے ہیں تو دوسری طرف کتاب کی صحیح قدر وقیمت متعین کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان کے مقدموں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

۱۔ مقدمہ تفسیر جواہر جز اول، | یہ علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصری کی شہرۂ آفاق عربی تفسیر کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا عبیدالرحمن رحمانی نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ معارف پریس سے پہلی بار ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا۔ اس تفسیر کا مقدمہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تحریر فرمایا تھا۔

اپنے مقدمہ میں وہ رقمطراز ہیں:

"قرآن کی کوئی تفسیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ شارح اور مفسر کا کام یہ ہے کہ ماتن کے اختصار کی تفصیل اور اجمال کی توضیح کرے ۔۔۔۔ اس کے کلام بے دلیل کی دلیل دے ۔۔۔۔ قرآن پاک کی تفسیر میں ان طریقوں کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی ہیں جو قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں۔" (مقدمہ)

سید صاحب کی مقدمہ نگاری کا یہ وصف خاص رہا ہے کہ وہ مقدمہ کے آغاز ہی میں کتاب کے موضوع کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ طویل تمہید اور بے حد تفصیل سے اپنے مقدموں کو بودا اور پھس پھسا نہیں ہونے دیتے اور رطب و یابس سے انہیں پاک رکھتے ہیں۔ درج بالا عبارت کے صرف چار جملوں میں سید صاحب نے کتاب کے موضوع کی نشاندہی اور اس فن کے اہم اصولوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور اطناب و تطویل سے گریز کرتے ہوئے جس مقصد کے پیش نظر یہ تفسیر لکھی گئی ہے، اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے ساتھ ہی ایسی دیگر تفاسیر میں عود کر آئی خامیوں کو بھی بیان کر دیا ہے۔ قرآنی تفسیر کے مسلمہ اصولوں کی جانب توجہ مرکوز کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے کا ماحول دوسرے زمانے سے بالکل الگ ہوتا ہے، عقلی مسلمات اور زمانے کے غیر محسوس عقائد ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اس لیے ہر کتاب کے مفہوم و معنی کے سمجھنے میں اس زمانے کے موثرات سے قطع نظر کرنا کسی طرح ممکن ہی نہیں ۔۔۔۔ اس لیے اگر مخلص اہل علم اور نیک نیت علما اس کام کی مزید تشریح اس زمانے کے موثرات کے مطابق اسی طرح کر سکیں کہ وہ متکلم کے اصول متواترہ، مخاطب اول صلعم کی تفہیم اور زبان کے لغت و قواعد کے

خلاف نہ ہوں تو ان کی یہ سعی مشکور ہوگی۔" (مقدمہ)

اس عبارت کی روشنی میں تفسیر کے متعلق سید صاحب کے خیالات واضح ہو جاتے ہیں ان تین نکات کو تفسیر کے لیے بنیاد بنا لیا جائے تو "تفسیر بالرائے" کے نقص سے وہ محفوظ رہے گی۔ شیخ طنطاوی کی تفسیر کو اسی کسوٹی پر پرکھنے کی سعی فرمائی۔ اس تفسیر کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مسلمانوں کو نئے علوم و فنون کی طرف متوجہ کرنا اور مسلمانوں کو یہ باور کرانا کہ ان کا یہ تنزل اس وقت تک دور نہ ہوگا جب تک وہ جدید سائنس اور دوسرے نئے علوم اور یورپ کے جدید آلات اور علمی و مادی قوتوں سے مسلح نہ ہوں۔"

(مقدمہ ص ۵)

لیکن عصری علوم کے مطابق قرآن کی تفسیر و تشریح کو وہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ایسی تفاسیر میں ہمارے اسلاف کی علمی خدمات کی کلی طور پر نکیر کی جاتی ہے۔ اس زہرناکی کے تدارک کے طریقے بھی سید صاحب نے بتائے ہیں اور ہند میں لکھی گئی ایسی تفسیروں کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں اسی خیال نے "تذکرہ" (علامہ شیخ عنایت اللہ خاں مشرقی کی طرف اشارہ ہے نشیط) کی صورت اختیار کی ہے۔ مگر افسوس کہ جو غلطی سرسید سے ان کے زمانے میں ہوئی صاحب تذکرہ سے اس زمانے میں ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کو یورپ کے علوم و فنون اور مادی قوتوں کی تحصیل کی طرف متوجہ کرنا بالکل صحیح ہے مگر اس کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنے ساڑھے تیرہ سو برس کے سرمایہ کو آگ لگا دیں۔ پہلے کے سارے مفسرین اہل لغت اہل قواعد اور اہل علم کو ایک

سرے سے جاہل اور دشمنِ اسلام اور احمق کہنا شروع کر دیں۔" (مقدمہ)

اس طرح سید صاحب نے زیر نظر مقدمہ میں اصول تفسیر، غلط تفاسیر کے نقصانات علم تفسیر میں قدماء کی تقلید کی ضرورت اور "تفسیر بالرائے" میں توازن کی اہمیت کے ساتھ طنطاوی کی تفسیر کی افادیت بھی بتائی ہے۔

۲۔ حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت کا مقدمہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ العالی کی یہ نہایت اہم کتاب ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۲۱ء کے آس پاس جب "شدھی تحریک" کی فتنہ انگیزی اور شرپسندی کو محسوس کیا جانے لگا تو مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دینی دعوت اور تبلیغی حکمت کی اہمیت سمجھ میں آئی۔ ان کی فکر، زہد و مجاہدہ سے میوات کے اجڑے اور سنگلاخ علاقے میں جو زبردست لیکن خاموش انقلاب آیا ویسا انقلاب ساری مسلم قوم کی زندگی میں آنا ضروری تھا تاآنکہ مسلمان بحیثیت قوم ان مادی کرشمہ سازیوں اور فتنہ پردازیوں سے خبردار ہو جائیں اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً پر کاربند رہیں۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ العالی نے اس دینی دعوت سے روشناس کرانے اور اس کی افادیت و اہمیت کو واضح کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی۔ جس کے دوسرے ایڈیشن میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مقدمہ لکھوایا جو ۱۹۴۷ء میں لکھا گیا تھا۔ جس کے متعلق مولانا محمد منظور نعمانیؒ رقمطراز ہیں۔

"ذیل کا مقالہ کتاب ہذا کے مقدمہ ہی کے طور پر لکھا گیا ہے جو افادیت کے اعتبار سے مستقل مقالہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ہمارے ناظرین بالخصوص دین کی دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے اگر غور سے پڑھیں گے تو نہایت مفید اور بصیرت افروز

ہدایات انہیں اس سے ملیں گی۔"

سید صاحب نے اس مقدمہ نما مقالہ کی پہلی ہی سطر میں کتاب کے موضوع "دعوت دین" کی اہمیت بتا دی ہے۔ پھر وہ قرآن و احادیث سے استدلال کرتے ہوئے فی زمانہ اس کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ "دینی دعوت" سے دوری اور اس سے اغماض برتنے کی وجہ سے جو برے نتائج امت کو جھیلنے پڑے اس کی پُرآشوب "داستان" نہیں تاریخی شواہد سید صاحب نے اتنے جامع انداز میں پیش کر دیے ہیں کہ تصویر نظر کے سامنے ابھرنے لگتی ہے۔ سید صاحب نے مولانا الیاس کی "دینی دعوت" کے اس مخصوص طریقہ کی ثمرآفرینی اور نتیجہ خیزی کو سراہتے ہوئے دیگر طریقوں کی ناکامی پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس (تبلیغی) ناکامی کے وجوہ کیا تھے؟ یہ سارا تماشا کام کرنے والوں کی دلی لگن کا نتیجہ نہ تھا اور نہ مبلغین و مناظرین و داعیان کے دلوں میں دین کی دھن تھی بلکہ جو کچھ تھا وہ داد و ستد کا مبادلہ اور نفع عاجل کی حرص و طمع تھی۔" (مقدمہ ص ۱۷)

لیکن مولانا الیاس کی اس "دینی دعوت" کو تمام نام نہاد تبلیغی تحریکوں کے بالمقابل سنت سے قریب اور اقرب الاصول مانتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"آیندہ اوراق میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس دعوت و تبلیغ کے علمی و عملی اصول و آئین کا تذکرہ ہے وہ موجودہ ہندوستان کی تمام دینی تحریکوں میں اصل اولی سے زیادہ قریب ہے۔" (مقدمہ ص ۲۵)

سید صاحب نے انبیا علیہم السلام کی "دعوت الی اللہ" کے آٹھ بنیادی اصول بتائے ہیں جن میں ۱۔ اخلاص ۲۔ بندگان الٰہی پر رحمت و شفقت اور خیرخواہی کا جذبہ ۳۔ حکمت ۴۔ ترغیب و ترہیب کی ترتیب ۵۔ داعی کا مدعو کے پاس پہنچنا ۶۔ نفیر ترک وطن، ۷۔ تعلیم

وتبلیغ کی گروہ بندی اور مذاکرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان ہی اصولوں پر مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا الیاس کی دینی دعوت کا تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ تحریک اصل اول سے قریب ہے"۔

سید صاحب نے اس مقدمہ میں صاحب سوانح حضرت مولانا محمد الیاس کے خاندانی کوائف کے ساتھ اس خاندان کے دینی احسانات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان میں اس کام کی اجمالی تاریخ اور اس کی افادیت بھی بیان کر دی ہے جس سے مولانا الیاس کی سعی جمیل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سید صاحب کا یہ مقدمہ دیانت و شرافت کا بہترین مرقع ہے۔ انہوں نے مولانا الیاس کو قریب سے دیکھا تھا اور ان کے کام کے سلسلے میں بعض اجتماعات میں شریک بھی ہوئے تھے جس سے اسے سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ مقدمہ میں ان سارے تجربات کا نچوڑ آگیا ہے۔

۳۔ مکاتیب شبلی پر مقدمہ "مکاتیب شبلی" مولانا سید سلیمان ندوی کی مرتبہ تصنیف ہے۔ اس میں نہایت اہتمام سے مولانا شبلی کے خطوط جمع کر دیے ہیں۔ اس کتاب پر ایک بسیط مقدمہ مولانا شبلی کے کوائف، عادات و خصائل اور آپ کی ادبی خدمات کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ "دائرۂ ادبیہ" کے خطوط میں محاسن ادبی اور لطائف شعری پر موصوف کی گل افشانیاں، ادب و تاریخ فارسی کے مباحث، طرز نگارش اور وہ جادو بھرے الفاظ جو شبلی کے قلم خاص کا وصف رہا ہے (آج کے زمانے کے سامری سینکڑوں منتر دل میں وہ روح پیدا نہیں کر سکتے)، سب پر مولانا سید سلیمان ندوی نے اس مقدمہ میں بالتفصیل لکھا ہے۔

سید صاحب اور علامہ شبلی میں چونکہ شاگرد و استاد کا رشتہ تھا۔ اس لیے استاد کے

تئیں عقیدت کے لازمی نتیجہ میں شاگرد کی جانب سے بیجا تعریف کا گمان اس مقدمہ کو پڑھنے سے پہلے قاری کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے، لیکن جب یہ مقدمہ پڑھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ شاگرد نے اگرچہ اپنے تعلق خاطر کا لحاظ ضرور رکھا ہے مگر کہیں بھی انہوں نے اسپ قلم کو بے مہار نہ ہونے دیا۔ ہاں علامہ شبلی کی تحریر میں جو شگفتگی اور سلیقہ شعاری پائی جاتی ہے، اس کا اعتراف سید صاحب نے بار بار کیا ہے اور اس انداز کو انہوں نے بعض جگہ خود اپنایا بھی ہے۔

سید صاحب نے علامہ شبلی کی خطوط نگاری کی ان ہی خصوصیات کا اپنے مقدمہ میں ذکر کیا ہے جو شبلی کے خطوط کے اس انتخاب میں پائی جاتی ہیں۔ صاحب مقدمہ اور مرتب کتاب نے علامہ شبلی کے ہزارہا خطوط میں سے صرف تین قسم کے خطوط ہی کا انتخاب کیا ہے۔ ۱۔ سوانحی/نجی ۲۔ علمی اصلاحی اور قومی مسائل کے حامل ۳۔ انشا پردازی کے اعلیٰ نمونہ کے حامل خطوط۔ ان تینوں قسموں کے خطوط میں علامہ شبلی کا جو اسلوب نگارش رہا ہے اس کی بنیاد پر ذیل کی چھ خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔

۱۔ اختصار پسندی ۲۔ جامعیت ۳۔ آداب والقاب سے بے نیازی ۴۔ مولانا کی خوشخطی (شکستہ و نستعلیق کا سنگم) ۵۔ جواب کی پابندی اور ۶۔ مکتوب الیہ کے مذاق کا خیال۔ اس طرح "مکاتیب شبلی" کی ہر دو جلدوں کے سیکڑوں خطوط پر سید صاحب کا یہ مقدمہ متعلقہ فن کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

۴۔ مکاتیب مہدی پر مقدمہ علامہ شبلی کے مکاتیب کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی نے مہدی افادی کے مجموعہ خطوط پر بھی نہایت عمدہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو انشا نگاری کی جان ہے اور مہدی کے اسلوب نگارش کی متابعت نہیں بلکہ مطابقت کرتا ہے۔

مہدی افادی اردو کے بہترین انشاپردازوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو کے رومانوی ادب میں ان کا قد سب سے اونچا دکھائی دیتا ہے۔ جنس لطیف اور اس کے حسن جمال کے وہ پرستار ہیں، اسے "سرمایۂ نشاط" اور اس کی "فتوحات" کو "راحت جان" تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے مضامین "جمالیاتی ادب" کا مرقع ہیں تو مکاتیب "ادبی جمال کا آئینہ"۔ ایک میں حسن جمال کی جھلک ہے تو دوسرے میں حسن ادب آشکار ہے۔ مہدی "ناگفتنی" (جسے سن کر حیا نگاہ نیچی کرلے اور لاج شرم سے پانی پانی ہوجائے) کو گفتنی بنادیتے ہیں اور "سنجیدہ شوخی" کے ساتھ سپرد قلم کرتے ہیں وہ بھی اس انداز سے کہ متانت بلائیں لیتی ہے۔ مہدی کی طرز نگارش اس قدر دل نشین ہے کہ علامہ شبلی جیسے صاحب طرز ادیب کو بھی حسرت رہی کہ "کاش شعر العجم کے مولف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے"۔ علامہ شبلی ہی کے معاصر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے بھی مہدی کے طرز انشا کی خوب خوب تعریف کی ہے۔ لیکن مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقدمہ میں مہدی کی مکتوب نگاری پر جو کچھ لکھ دیا ہے بعد کے ناقدین مہدی نے اس کی نہ صرف پیروی کی ہے بلکہ اسی سے خوشہ چینی بھی کی ہے۔ چنانچہ آل احمد سرور، ڈاکٹر سلام سندیلوی وغیرہ کے یہاں سید صاحب ہی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اس مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مکتوب نگاری کی اجمالی لیکن جامع تاریخ پیش کردی ہے۔ جو اپنے اندر عمق وسعت رکھتی ہے۔ قدیم ترین مکاتیب سے لیکر توقیعات، شاہی فرامین، مذہبی مکتوبات اور جدید ترین فن مکتوب نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کا نچوڑ اس مقدمہ میں پیش کردیا ہے کہ مقدمہ پڑھنے والا ذہنی طور پر کتاب پڑھنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس مقدمہ میں سید صاحب نے مہدی افادی کے فن و اسلوب پر اتنا کچھ

پیش کر دیا ہے کہ بعد کے لکھنے والوں کا اسپ قلم حد سلیمان سے آگے نہ بڑھ سکا۔

۵۔ مقدمۂ گلستان امجد

امجد حیدرآبادی صوفی منش بزرگ تھے۔ طغیانی موسیٰ میں ان کا مال و اسباب اور گھر بار لٹ گیا تھا۔ خانہ خراب حال زندگی میں ادب کے گلستاں سجائے۔ انکو فن رباعی پر ید طولیٰ حاصل تھا۔ اخلاقی موضوعات پر انکی رباعیاں نہایت بلند مقام کی حامل ہیں۔ اردو ادب میں امجد اور رباعی لازم و ملزوم ہوگئے ہیں۔ چونکہ وہ صوفی تھے اور صوفیانہ اوراد و اشغال میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ اس لیے اللہ ہو اور الا اللہ کو جس طرح "ذکر سحر گاہی" بنالیا تھا، اس کی بازگشت ان کی رباعیوں میں صاف سنائی دیتی ہے۔ رباعیات کے علاوہ انہوں نے سعدی شیرازی کی گلستان کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس صاف سلیس اور آزاد ترجمہ پر مولانا سید سلیمان ندوی نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

شمال و دکن آزادی سے قبل سیاسی سطح پر جس طرح ایک دوسرے سے مختلف رہے تھے ادبی سطح پر بھی یہ منافرت ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ شمال میں "کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑکر" کہہ کر دلی کو حیدرآباد پر فوقیت دی گئی تھی تو دکن والوں نے بھی شمالی ادب کو اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن مولانا سید سلیمان ندوی نے دکن کے اس ہیرے کی قدر کی، اس کو پرکھا، اس کی قیمت متعین کی اور یاقوت شیراز حضرت شیخ سعدی کے ہم پلہ اُسے گردانا۔ سید صاحب نے سعدی شیرازی اور امجد حیدرآبادی کی شخصیت اور ان کے کارناموں میں مطابقت و مماثلت تلاش کی، یہاں تک کہ بالآخر آپ نے لکھ دیا۔

"سعدی کی نظم و نثر دونوں کا ترجمہ مترجم نے نثر میں کر دیا ہے اور سعدی کی نظم کی جگہ خود اپنی ہم معنی نظم فرد قطعہ یا رباعی کی صورت میں درج کی ہے اور اس طرح گلستان سعدی گلستان امجدی بن گئی ہے"۔

سید صاحب نے دعائیہ کلمات کے ساتھ اپنے مقدمہ کو ختم کیا ہے۔

(باقی)

آزاد بلگرامی کی عربی خدمات

از: ڈاکٹر سید حسن عباس۔ ایران

میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ - ۱۲۰۰ھ) عربی اور فارسی زبان و ادب میں یکساں مہارت اور تسلط و عبور رکھنے والے بارہویں صدی ہجری کے ان مقتدر علما و فضلائے ہند میں ایک ہیں جن کی گرانقدر خدمات ہندوستانی مسلمانوں کے لیے باعث صد افتخار ہیں۔

مولانا آزاد بلگرامی نے عربی اور فارسی میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور نظم و نثر میں کافی علمی۔ ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ صاحب اتحاف النبلا نے ان کے عربی اشعار کی تعداد دس ہزار ابیات بتائی ہے[1]۔ عربی زبان و ادب میں مولانا آزاد بلگرامی کی عظیم خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر زبید احمد[2]، ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی[3]، جناب عبد المنان[4]، ڈاکٹر زیتون بیگم[5]، جناب عبد المقصود محمد الشلغامی[6]،

---

[1] صدیق حسن خاں: اتحاف النبلا ص ۲۳۱ [2] ڈاکٹر زبید احمد نے اپنی کتاب :- THE CONTRI-BUTION OF INDIA TO ARADIC LITERATURE- LAHORE 1968 میں آزاد بلگرامی کی عربی زبان و ادب کی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ مذکورہ کتاب عربی اور اردو میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اردو ترجمہ پاکستان سے اور عربی ترجمہ بغداد سے شایع ہوا ہے [3] ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی نے آزاد بلگرامی کی گرانقدر تصنیف سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کی تصحیح و تنقیح کا کام نہایت دلسوزی سے کیا اور علی گڑھ سے دو جلدوں میں شایع کیا [4] جناب عبد المنان نے آزاد بلگرامی کے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۵ پر)

اور جناب عبد السلام فہمی[7] کی تحقیقی کاوشیں قابلِ ستایش ہیں۔ آزاد بلگرامی کی بزرگی اور فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسے کتبخانے کے مالک تھے جس میں پچیس ہزار جلد کتب تھیں۔ اس سلسلے میں حافظ احمد علی شوق رامپوری (م ۱۹۳۳ء) کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بلگرام میں مولوی غلام علی آزاد کا کتبخانہ بھی بڑی نمود کا تھا۔ مشہور ہے کہ پچیس ہزار جلد تھی۔ میں نے خود ان کی درسگاہ کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر دسمبر ۱۸۹۸ء میں دیکھے۔ رہنے کا مکان سلامت ہے صرف تین الماریاں ردی سے بھری ہوئی پائیں جس میں دو دو چار چار ورق مختلف کتابوں کے پڑے ہوئے ہیں۔ دس بارہ عربی کے دیوان بھی دیکھے جو عام طور پر ہندوستان میں نہیں ملتے۔"[8]

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۴) عنوان سے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں ایم اے کا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ [5] ڈاکٹر زیتون بیگم نے مکہ معظمہ یونیورسٹی سے "غلام علی آزاد بلجرامی و تاثیر الادبی علی لغۃ العربیۃ" کے موضوع پر ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے ڈگری حاصل کی [6] جناب عبد المقصود الشلغامی نے دانش گاہ پنجاب لاہور سے ۱۹۷۴ء میں "شعر غلام علی آزاد بلجرامی" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی [7] جناب عبد السلام فہمی نے ۱۹۸۴ء میں "غلام علی آزاد بلجرامی وادب الفارسی" کے موضوع پر ایک کتاب اشاعت کے لیے تیار کی تھی مگر اس کی اشاعت کے بارے میں لاعلم ہوں [8] - حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری: تاریخ کتب خانۂ عالیۂ دار الریاسۃ مصطفی آباد عرف رام پور (قلمی) ص ۱۱ مخزونہ کتبخانہ رضا رامپور نمبر ۱۴۰ [فہرست مخطوطات اردو از مولانا عرشی ص ۲۶۹]

علاوہ ازیں مختلف تذکروں میں بھی آزاد بلگرامی کی علمی فضیلت عربی و فارسی میں مہارت اور مذکورہ زبانوں میں ان کی خدمات کا ذکر بڑے اچھے پیرایہ میں ملتا ہے۔ ان تذکرہ نویسوں نے ان کے علمی فضل اور کارہائے نمایاں کا کھلے دل سے اعتراف کرنے کے ساتھ ان کے اعلیٰ اخلاقی اور انسانی فضائل کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کی مشہور زمانہ کتاب "سبحۃ المرجان فی آثار ھندوستان" کا شہرہ سرزمین عرب میں بھی اتنا ہی رہا جتنا کہ سرزمین ہند میں۔ مسقط کے امام[1] نے اس کی تعریف کی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے علاوہ مصر سے بھی شایع ہوئی ہے[2] اگر وہ شاعری میں خود کو "حسان الھند" کے لقب کا سزاوار گردانتے ہیں تو یہ حق بجانب بھی ہے:

چوں مدحِ رسولؐ، کامِ من شد — حسان الھند، نامِ من شد[3]

یا اگر یہ کہتے ہیں:

درہند چو من طوطی خوشگو نتوان یافت — ہم حرف شدم چشمِ غزالانِ حرم را
آزاد از آں شعلہ کہ دارد سخنِ من — افروختہ ام شمع و چراغِ آب و عم را

تو اسے شاعرانہ تعلی پر محمول نہیں کیا جا سکتا ہے۔

آزاد بلگرامی کے عربی کلام کے نمونے بھی جا بجا ملتے ہیں مثلاً نزھۃ الخواطر جلد ششم ص ۲۰۴ تا ۲۰۵؛ اتحاف النبلاء ص ۳۳۱ تا ۳۳۵ اور خزانۂ عامرہ ص ۴۰ تا ۱۴۵۔

علاوہ ازیں ان کے چند مختصر دواوین شایع بھی ہو چکے ہیں جن کی تفصیل آیندہ سطور میں

---

[1] مولوی عبد الجبار ملکاپوری؛ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن جلد ا ص ۲۸۳-۲۸۴ [2] علامہ شمس بریلوی: مقدمہ ترجمۂ مآثر الکرام (اردو) ص ۹۰ مطبوعہ کراچی ۱۹۸۳ [3] آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ ص ۴ مطبوعہ کانپور ۱۸۷۱ء

ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ عربی زبان میں مختلف موضوعات پر آزاد بلگرامی کی درج ذیل تالیفات و تصنیفات ملتی ہیں:-

۱۔ سبحۃ المرجان فی آثار ھندوستان | آزاد کی عربی میں سب سے مشہور کتاب یہی ہے۔ جو ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں تالیف کی گئی۔ جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اس کا موضوع ہندوستان سے متعلق ہے۔ یہ چار فصلوں پر مشتمل ہے:

فصل اول: تفسیر و احادیث میں ہندوستان کے بارے میں جو اشارے ملتے ہیں ان کے بیان میں۔

فصل دوم: علمائے ہند کے ذکر میں۔ اس فصل میں ۴۵ صاحب تصانیف علماء کا تذکرہ ہے منجملہ مصنف۔

فصل سوم: محاسن کلام کے بارے میں۔

فصل چہارم: عاشق و معشوق کے ذکر میں (فی بیان المعشوقات والعشاق)

پہلی فصل میں آزاد نے اپنا ایک مستقل رسالہ "شمامۃ العنبر فیما ورد فی الھند من سید البشر" کو شامل کیا ہے۔ انہوں نے یہ رسالہ ۱۱۶۲ھ میں آرکاٹ میں لکھا تھا[1] فہرست کتب خانۂ آصفیہ میں اس کا سال تالیف ۱۱۹۶ھ اور مقام تالیف ٹونک بتایا ہے[2] جو درست نہیں ہے۔

دوسری فصل میں جن علماء کا تذکرہ آیا ہے۔ ان کی فہرست ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی

---

[1] آزاد بلگرامی: سرو آزاد، ص ۲۹۵؛ مطبوعہ لاہور ۱۹۱۳ء [2] فہرست آصفیہ ۱/۴۹۳ نیز دیکھیں ڈاکٹر زبید احمد ص ۱۹۱ و ۳۰۴۔

کے شایع کردہ نسخے کے مطابق درج کی جارہی ہے[1]

۱۔ ابوحفص، ربیع بن صبیح السعدی البصری (ص ۶۳) ۲۔ ابوالفیض، فیضی الاکبرآبادی (ص ۱۱۷) ۳۔ احمد التانیسری (ص ۹۲) ۴۔ احمد بن عبدالاحد الفاروقی السھرندی (ص ۱۲۳) ۵۔ احمد المعروف بہ ملاجیون الصدیقی الامیتوی (ص ۲۰۴) ۶۔ الہداد الجون فوری (ص ۱۰۵) ۷۔ امان اللہ بن نوراللہ بن حسین البنارسی (ص ۱۹۹) ۸۔ الحسن الصغانی اللاہوری (ص ۷۰) ۹۔ حمیدالدین الدہلوی (ص ۷۳) ۱۰۔ سعدالدین الخیرآبادی (ص ۱۰۲) ۱۱۔ سعداللہ السلونی (ص ۲۲۸) ۱۲۔ شمس الدین یحییٰ الاودی (ص ۷۲) ۱۳۔ شہاب الدین بن شمس الدین بن عمرالزاولی الدولۃ آبادی (ص ۹۵) ۱۴۔ صبغۃ اللہ البروجی (ص ۱۲۰) ۱۵۔ طفیل محمد بن شکراللہ الحسینی الاترولوی البلکرامی (ص ۲۳۰) ۱۶۔ عبدالجلیل بن احمد الحسینی الواسطی البلکرامی (ص ۲۰۵) ۱۷۔ عبدالحق الدہلوی (ص ۱۴۱) ۱۸۔ عبدالحکیم السیالکوتی (ص ۱۷۰) ۱۹۔ عبدالرشید الجون فوری الملقب بہ شمس الحق (ص ۱۷۲) ۲۰۔ عبداللہ بن الہداد العثمانی التلنبی (ص ۱۰۳) ۲۱۔ عبداللہ بن سالم البصری المکی (ص ۲۵۰) ۲۲۔ عبدالمقتدر بن رکن الدین الشریحی الکندی الدہلوی (ص ۵) ۲۳۔ عصمۃ اللہ السہارن فوری (ص ۱۳۸) ۲۴۔ علی بن احمد المہائمی (ص ۹۷) ۲۵۔ علی بن احمد بن معصوم الدشتکی الشیرازی (ص ۲۱۷) ۲۶۔ علی المتقی (ص ۱۰۶) ۲۷۔ غلام علی بن نوح الحسینی [مصنف] (ص ۲۹۸) ۲۸۔ غلام نقشبند بن عطاء اللہ الکنوی (ص ۲۰۱) ۲۹۔ قطب الدین السہالوی (ص ۱۹۳) ۳۰۔ قطب الدین الشمس آبادی (ص ۱۹۶)

[1] آزاد بلگرامی: سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، بکوشش: ڈاکٹر فضل الرحمٰن الندوی مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۶ء و ۱۹۸۰ء [۲ جلدوں میں]

۳۱۔ قمرالدین الحسینی الاورنقابادی (ص ۲۶۲) ۳۲۔ محب اللہ البہاری (ص ۱۹۷) ۳۳۔ محمد بن عبدالجلیل الحسینی الواسطی البلکرامی (ص ؟) ۳۴۔ محمد حیات السندی المدنی (ص ۲۴۴) ۳۵۔ محمد زاہد بن محمد اسلم الہروی الکابلی (ص ۱۷۳) ۳۶۔ محمد طاہر الفتنی (ص ۱۰۹) ۳۷۔ محمد یوسف بن محمد اشرف الحسینی الواسطی البلکرامی (ص ۲۵۷) ۳۸۔ محمود الفاروقی الجون فوری (ص ۱۴۲) ۳۹۔ مسعود بن سعد بن سلمان اللاہوری (ص ۶۲) ۴۰۔ معین الدین العرافی الدہلوی (ص ۹۰) ۴۱۔ نظام الدین بن قطب الدین السہالوی (ص ۲۴۳) ۴۲۔ نورالحق بن عبدالحق الدہلوی (ص ۱۴۱) ۴۳۔ نورالدین محمد صالح الاحمدآبادی (ص ۲۴۲) ۴۴۔ نورالہدی بن قمرالدین الاورنقابادی (ص ۲۸۸) ۴۵۔ وجیہ الدین العلوی الکجراتی (ص ۱۱۵)

تیسری فصل محاسن کلام سے متعلق ہے اور ان صنایع و بدایع کے بیان میں ہے جنھیں ہندوستانیوں اور خود مولف [آزاد بلگرامی] نے اختراع اور استخراج کی ہیں۔

چوتھی فصل، نایکا بھیدیا ’فی بیان المعشوقات والعشاق‘ سے متعلق ہے۔

ترجمۂ فارسی سبحۃ المرجان

(الف) مولانا آزاد بلگرامی نے اپنے دو شاگردوں مہربان اورنگ آبادی[1] اور شفیق اورنگ آبادی[2] کی فرمایش پر سبحۃ المرجان کی دو فصلوں

[1] سید شاہ عبدالقادر معروف بہ فخری متخلص بہ مہربان (۱۱۴۲-۱۲۰۴ھ) آزاد کے بہترین شاگردوں میں تھے۔ انہوں نے آزاد سے کتب ادب و حدیث پڑھنے کے علاوہ شاعری میں ان ہی سے اصلاح لی۔ مہربان تخلص بھی آزاد کا عنایت کردہ ہے۔ ان کو تصوف اور فلسفہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ ادب و تصوف میں کئی کتابیں یادگاریں چھوڑیں جن میں کچھ طبع ہو چکی ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ رجوع کریں: دو رسالہ در نقد ادبی بکوشش ڈاکٹر سید حسن عباس شایع کردہ رام پور رضا لائبریری ۱۹۹۷ء [2] لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (۱۱۵۸-۱۲۲۳ھ) کا شمار بھی آزاد کے اہم شاگردوں میں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۰ پر)

(فصل سوم وچہارم) کا ۱۱۰۸ھ میں فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "غزلان الہند"[1] رکھا۔ یہ نام تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۰۸ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔

(ب) سبحۃ المرجان کی پہلی اور دوسری فصلوں کا لفظی فارسی ترجمہ سید شمس الدین حسنی الحسینی بنارسی نے راجا ایسر پرساد کی فرمایش پر کیا تھا۔ اس کا واحد نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ نمبر ۶۵۳، نستعلیق خوش، تاریخ ترجمہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء، ۱۱۲ ورق[2]

آغاز: "خدائی راکہ رب دوجہان است ثنایش خارج از نطق وبیان است

کند طی وادی حمد الہی کرا این زہرہ وتاب وتوان است"

انجام: "... واین ہر سہ کتاب تذکرۂ شعرای ایران وتوران وہندوستان است وروضۃ الاولیا کہ در تذکرۂ بعضی اولیا است ومآثر الکرام تاریخ بلگرام ذکر کردم در احوال واولیای بلگرام وفضلا وشعرای آن را وسند السعادات در حسن خاتمہ بسادات ودیوان شعر ورسائل دیگر۔"

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۹) ہوتا ہے اردو اور فارسی میں شاعری کرتا تھا اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص تھا۔ اس کا تخلص شفیق بھی آزاد کا عطیہ ہے۔ تذکرہ نویسی میں مہارت رکھتا تھا۔ اسکے کئی تذکرے ہیں جو اس کی شہرت کا باعث بنے۔ یہ تذکرے شایع ہوچکے ہیں۔ تذکروں کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی اس کی کئی تصانیف ملتی ہیں۔

[1] ملاحظہ ہو راقم السطور کا مقالہ "غزلان الہند" مطبوعہ خدابخش لائبریری جرنل شمارہ ۷۷-۷۶۔ راقم نے غزلان الہند کا متن کئی نسخوں کی مدد سے تصحیح کرنے کے بعد اشاعت کے لیے آمادہ کر لیا ہے۔

[2] CATALOGUE OF THE ARABIC AND PE-RSIAN MSS. IN THE K. B. O. P. LIBRARY PATNA VOL VIII/7-8, 2ND EDITION 1993

ترجمۂ اردو سید شمس الدین حسنی الحسینی بنارسی (مترجم فارسی) نے اردو میں بھی ان ہی دو فصلوں (فصل اول ودوم) کا لفظی ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام "مظہر آدم" رکھا، یہ نام تاریخی ہے اور اس سے ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۰ء کا سال برآمد ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ مطبع نامی منشی نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۳ صفحات میں ۱۲۹۵ھ میں ہی شایع ہوا۔ مطبوعہ نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہے اور مجھے اس کا عکس جناب مشفق خواجہ صاحب کے توسط سے حاصل ہوا۔ اس عنایت کے لیے میں موصوف کا شکر گزار ہوں۔

سبحۃ المرجان کے ایڈیشن یہ کتاب ہندوستان میں دو مرتبہ اور مصر میں ایک بار زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہے۔

۱۔ بمبئی، ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء، ۲۹۸ صفحات، بار اول

۲۔ علی گڑھ، دو جلدوں میں، پہلی جلد ۱۹۷۶ء (مشتمل بر دو فصل۔ اول ودوم) اور دوسری جلد (مشتمل بر دو فصل۔ سوم وچہارم) بہ تصحیح ومقدمہ از ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی۔ ڈاکٹر ندوی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے اس کتاب کی تصحیح کا کام کیا تھا۔ دوسری جلد ۱۹۸۰ء میں شایع ہوئی تھی بخط نسخ۔

۳۔ مصری ایڈیشن کا ذکر علامہ شمس بریلوی نے مآثر الکرام کے اردو ترجمہ (از مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری) کے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔

سبحۃ المرجان کے قلمی نسخے اس مشہور ومعروف کتاب کے متعدد قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

- دہلی، نیشنل میوزیم، بخط مولف [۱]
- لاہور، دانشگاہ پنجاب، شمارہ ARF II 8628، نستعلیق، حسین بن محمد علوی، ۱۲۵۳ھ ۹۲ ورق [۲]
- لکھنؤ، کتب خانۂ ندوۃ العلماء، شمارہ ۱۷۹۵، نسخ عباس بن احمد یمانی، ۱۲۹۲ھ، بھوپال، ۳۲۴ ص [۳]
- حیدرآباد، کتب خانۂ آصفیہ، شمارہ ۱۹ [۴] در فن تاریخ عربی،
- کلکتہ، کتابخانۂ مدرسہ عالیہ، شمارہ ۸۸ (تلخیص)
- لندن، برٹش میوزیم [۵]
- مانچسٹر، کتابخانہ جان ریلاندس، شمارہ [۴۶۳] ۲۹۲۔

فہرست نویس نے سہواً مولف کا نام "جلال الدین آزاد ..." لکھا ہے۔ جو درست نہیں ہے [۶]

---

[۱] اس کی اطلاع مجھے پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب سے حاصل ہوئی ہے۔ موصوف نے یہ بھی بتایا کہ یہ وہی نسخہ ہے جسے آزاد بلگرامی نے مسقط کے امام کے پاس بھیجا تھا، اس پر انکے دستخط بھی موجود ہیں۔ [۲] QAZI ABDUL NABI KAUKAB: HANDLIST OF ARABIC MAN-USCRIPTS IN THE PUNJAB UNIVERSITY LIBRARY P.290, LAHORE 1982 [۳] فہرست نسخہ ہای خطی عربی کتابخانۂ ندوۃ العلماء لکھنؤ، جلد ۲ ص ۶۱۵، مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی در ہند، خانۂ فرہنگ ایران، دہلی نو ۱۴۰۶ھ [۴] فہرست آصفیہ ۱/ ۱۹۸ [۵] جلد ۳ ص ۱۰۲۲ ب و ۱۰۵۵ ب [۶] A. MINGANA, D.D: CATALOGUE OF THE ARABIC MSS. IN THE JOHN RYLANDS LIBRARY, P. 462, MANCHESTER, 1934-

- علی گڑھ، مولانا آزاد لائبریری، ذخیرۂ احسن مارہروی، شمارہ ۹ / ۹۵۴-۱، نستعلیق خوش، ۴۰۶ ص۔
- پٹنہ، کتابخانۂ خدابخش، شمارہ ۸۱۰، نسخ، ۱۹ویں صدی، ۳۱۶ ورق [۱]
- پٹنہ، کتابخانۂ خدابخش، شمارہ ۸۱۱، نسخ، ۱۱ شوال ۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۷ء ۳۹ ورق [۲]

۲۔ ضوء الدراری شرح صحیح البخاری | مولانا آزاد نے کتاب الزکات تک صحیح بخاری کی شرح لکھی تھی۔ انہوں نے یہ شرح حرمین شریفین کے قیام کے زمانے میں یعنی ۱۱۵۱ھ میں لکھی۔ وہ اس وقت حج کے لیے وہاں گئے ہوئے تھے لیکن تاخیر سے پہونچے پر مناسک حج ادا نہ کر سکے تو پھر وہیں مقیم ہوگئے تاکہ آیندہ سال حج سے مشرف ہوسکیں۔ اس درمیان انہوں نے وہاں شیخ عبدالوہاب طنطاوی اور شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث و تفسیر اور دیگر علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مذکورہ رسالے میں شرح کے ہمراہ متن بھی ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ کتابخانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں موجود ہے۔ نمبر ۳۶۴، نستعلیق، بخط مصنف، ۱۱۵۱، ۴۹ صفحہ، ۲۳ سطر [۳]

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی صاحب ابجد العلوم نے نسخہ مولف کو دیکھا تھا۔ حکیم عبدالحئی صاحب نزھۃ الخواطر نے بھی نواب صاحب کے صاحبزادے سید نورالحسن کے کتب خانے میں اس نسخہ کو دیکھا تھا۔ علاوہ ازیں نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتاب "الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ" میں آزاد کے اس رسالے کا ذکر کیا ہے [۴]

---

[۱] و [۲] فہرست کتابخانہ خدابخش پٹنہ ۱۲/ ۱۵۸-۱۵۰، مفتاح الکنوز ۲/ ۲۰۱ [مفتاح الکنوز میں نمبر ۳۱۱/۲، نستعلیق، ۱۴ویں صدی اور ورق ۱۹۵ ملتا ہے] مرتبہ سید اطہر شیر مطبوعہ یونین پریس پٹنہ ۱۹۶۵ء

[۳] فہرست ندوہ ۳/ ۱۱۶ از زبید احمد ص ۴۰۳ [۴] الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ ص ۲۲۶ مطبوعہ اسلامی اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء۔

۳۔ شفاء العلیل فی اصلاح کلام ابی الطیب المتنبی | آزاد بلگرامی نے اس رسالے میں مشہور عرب شاعر المتنبی کے کلام میں معانی و بیان کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور بسا اوقات اصلاح بھی کی ہے۔ اس کا سال تالیف ۱۱۹۶ھ ہے۔ یہ رسالہ بھی اپنی نوعیت کا نہایت اہم رسالہ ہے۔ ظاہر ہے متنبی جیسے شاعر کی فروگزاشتوں کی نشاندہی آزاد جیسا باکمال ہی کر سکتا تھا۔ اس رسالے کے متعدد قلمی نسخے درج ذیل کتب خانوں میں ملتے ہیں:

- حیدرآباد، کتب خانہ آصفیہ، شمارہ ۱۱۳ درفن دواوین عربی۔
- حیدرآباد، کتب خانہ سید علی حسین بلگرامی [1]
- حیدرآباد، سالار جنگ میوزیم [2] (۲ نسخے)
- لکھنؤ، کتابخانۂ ندوۃ العلماء، شمارہ ۱۴۵۵، نستعلیق، سید نور الحسن قنوجی، ۵۰ ص، ۲۵ سطر [3]

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے سالار جنگ کے مذکورہ دونوں نسخوں کی مدد سے اس رسالے کے متن کی تصحیح کی ہے اور اپنے مفید حواشی سے مزین کرکے مجلہ ثقافت الہند (دہلی)، جلد ۳۵ شمارہ ۳/۴ اور جلد ۳۶ شمارہ ۱/۲ میں شایع کیا ہے۔ ابھی پورا

[1] NAZIR AHMAD: NOTE ON IMPORTANT ARABIC AND PERSIAN MSS. FOUND IN VARIOUS LIBRARIES IN INDIA JOURNAL OF ROYAL ASIATIC SOCIETY OF BENGAL, NEW SERIES VOL. XIII P.C. xxxis, 1917 [2] مجلہ منادی دہلی، جلد ۶۷ شمارہ ۴/۵، ۱۹۹۲ء [3] فہرست ندوہ ۳/۶۳۴۔

رسالہ طبع نہیں ہو سکا ہے لیکن امید ہے کہ بہت جلد کتابی صورت میں منظر عام پر آجائے گا۔

۴۔ شمامۃ العنبر فی ما ورد فی الهند من سید البشر | مولف نے اس مختصر سے رسالے میں ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جو ہندوستان سے متعلق ہیں۔ آزاد سے پہلے کسی ہندوستانی نے بھی اس پہلو پر توجہ نہیں دی تھی۔ انہوں نے ۱۱۶۲ھ میں آرکاٹ میں اسے تالیف کیا اور سبحۃ المرجان میں شامل کیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس رسالے کے تین نسخے ملتے ہیں نمبر ۸۵۳، ۸۵۷ اور ۸۵۹ ہیں۔

ایک اور نسخہ کتابخانہ حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف احمد آباد میں ہے جس کا نمبر ۱۹۷ ہے۔ یہ نسخہ خط نسخ میں مورخہ ۹ ذی قعدہ ۱۲۲۴ھ کا ہے۔ اس کی کتابت بندر سورت میں ہوئی ہے۔ اس میں ۵۷ ورق ہیں [1]۔

۵۔ مثنوی مظہر البرکات | مولانا آزاد بلگرامی نے مثنوی مولانا روم کی تقلید میں عربی میں سات دفتروں میں یہ مثنوی تالیف کی اور دعوا کیا ہے کہ ان سے پہلے کسی نے بھی بحر خفیف میں مزدوجہ نہیں کہا ہے۔ اس مثنوی میں انہوں نے فلسفیانہ، متکلمانہ اور عارفانہ افکار کو مثنوی معنوی کی طرح مختصر حکایتوں اور داستانوں نیز تمثیلوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس مثنوی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی نے مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں نہایت عمدہ مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ انہوں نے اپنے مذکورہ مقالے میں علی گڑھ کے نسخے کو متعارف کرایا ہے۔ مثنوی کی

[1] حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف کتبخانہ: عربی، فارسی، اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست، جلد دوم، ص ۱۵۲۔ ناشر محمد بھائی ٹوپی والا، سکریٹری درگاہ شریف ٹرسٹ احمد آباد ۱۹۹۳ء۔

مظہر البرکات کو آزاد نے ۱۱۹۳ھ سے ۱۱۹۶ھ کے دوران مکمل کیا۔

واضح رہے کہ آزاد نے ابتدا میں اسے چار دفتروں میں تالیف کیا تھا، مگر بعد میں اپنے پوتے امیر حیدر بن نور الحسن کی فرمائش پر تین دفتروں کا اضافہ کیا جن کی تفصیل یہ ہے:

دفتر اول : سال تالیف ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء اورنگ آباد میں، بمدت ایک سال

دفتر دوم : " ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء حیدرآباد میں تقریباً ۵ ماہ کے دوران

دفتر سوم و چہارم : اورنگ آباد میں جمادی الآخرہ ۱۱۹۵ھ میں شروع کیا اور شعبان ۱۱۹۵ھ میں مکمل کیا۔

دفتر پنجم، ششم و ہفتم: سال تالیف ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء۔

دفتر اول میں حمد نہیں ہے لیکن دیگر تمام دفتروں میں حمد موجود ہے اور ہر دفتر کے آخر میں ایک خاتمہ بھی ہے۔

یہ مثنوی ابھی غیر مطبوعہ ہے اور اس کے قلمی نسخے درج ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں:

- حیدرآباد، کتب خانہ آصفیہ، بخط مولف۔[1]
- مانچسٹر، کتابخانہ جان ریلانڈس، ۱۸۱ الف (از ص ۳ ب - ۱۷۴ الف) یہاں مُظہِر البرکات لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔[2]
- کتابخانہ پرنسٹن[3]

---

[1] قاموس العلوم ستون ۳۶ [2] فہرست مخطوطات عربی کتابخانہ جان ریلانڈس مانچسٹر ص ۹۶ [3] فہرست مخطوطات عربی کتابخانہ پرنسٹن ۱۹۲۸ء بہ نقل از تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان از ڈاکٹر علی رضا نقوی ص ۲۰۰، مطبوعہ تہران ۱۹۶۴ء۔

- علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، کتابخانہ مولانا آزاد، ذخیرہ احسن مارہروی، شمارہ ۱۷/۸۹۱، نستعلیق خوش، محمد قاسم علی، ۱۳۰۲ھ، ۳۶۸ ورق (از ۳۶۹ تا ۳۰۵ ورق قصیدۂ مرأۃ الجمال]
- علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، کتابخانہ مولانا آزاد، ذخیرۂ حبیب گنج، شمارۂ مسلسل ۷۴۴، شمارۂ نسخہ ۳۰/۳۰. H.G، نستعلیق، ذوالفقار احمد ابن سید ہمت علی نقوی بھوپالی، ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء، متقابلہ شدہ در ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء، ۱۲۲ ورق۔[1]
- لکھنؤ، کتابخانہ ندوۃ العلماء، شمارہ ۳۰۷/۵۰۲۰۔[2]
- پٹنہ، کتابخانہ خدابخش، شمارہ ۲۶۴۱، از ورق ۱ الف تا ۱۴۷ب۔ اس نسخہ کے آخر میں ورق ۱۲۸ الف سے ۱۳۲ ب تک مرأۃ الجمال ہے۔[3]

۶۔ دواوین عربی عربی زبان میں آزاد کے دس دواوین ہیں۔ ان دواوین کا دو انتخاب تیار کیا گیا۔ ۱۔ السبعۃ السیارہ۔ نواب صدیق حسن خاں[4] کے لیے اور دوسرا

---

[1] M.M. QAISER: DESCRIPTIVE CATALOGUE OF ARABIC MSS. OF HABIBGANJ COLLECTION MAULANA AZAD LIBRARY ALIGARH, P.337, ALIGARH. 1993 [2] فہرست ندوہ ۳/۶۵۴ [3] فہرست کتابخانہ خدابخش۔ پٹنہ ۲۳/۱۵۱-۱۴۸؛ مفتاح الکنوز ۱/۲۰۶، شمارہ ۱۸۳۸ کے تحت مظہر البرکات کا سنہ کتابت سنہ ہزار لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے [4] نواب صدیق حسن خاں: اتحاف النبلاء ص ۳۳۱۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

"ہفت دیوان عربی مسمّیٰ بہ سبع سیارہ، و در وی قصاید، مستزاد و مردف و مزدوج و ترجیع است کہ ہیچ شاعری قبل ایشان این چنان نظم کردہ ہرگز از اہل ہند بہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۸ پر)

"مختارات دیوان آزاد" کے نام سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں مطبع آسی لکھنؤ سے شایع ہوا۔ السبعہ السیارہ کا مخطوطہ بخط آزاد کتابخانہ نور الحسن (ابن نواب صدیق حسن خاں) لکھنؤ میں تھا[1] صاحب نزہتہ الخواطر نے اس دیوان کو کتابخانہ نور الحسن لکھنؤ میں دیکھا تھا[2]

آزاد کے یہ دواوین مختلف اوقات میں مختصر جزو کی صورت میں شایع بھی ہوئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

الدیوان الاول: مطبع کنز العلوم حیدر آباد دکن سے شایع ہوا۔ تعداد صفحات ۶۱۔ سال تالیف ۱۱۸۰ھ۔

الدیوان الثانی: مطبع لوح محفوظ حیدر آباد دکن سے، تعداد صفحات ۵۸، سال تالیف ۱۱۸۰ھ۔

الدیوان الثالث: مطبع کنز العلوم حیدر آباد دکن سے، تعداد صفحات ۴۸، سال تالیف ۱۱۸۰ھ۔

الدیوان الرابع: ۱۱۹۰ھ[3] (غالباً سال تالیف ہے)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۷) سماعت نرسیدہ کہ او را یک دیوان عربی باشد تا بہ ہفت دیوان چہ رسد، درین دواوین در مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معانی کثیرۂ نادرہ ایجاد فرمودہ کہ مثل آن ہیچ یکی را از شعرای متقدمین وفصحای متشدقین میسر نگشتہ، وی حسان ہند است" (اتحاف النبلاء ص ۳۳۱)

[1] NAZIR AHMAD, J.R.A.S.B. NEW SERIES, VOL. XIII P. C.XXXIV, 1917. WAJAHAT HUSAIN: J.R.A.S.B. VOL II NO 2. 1936

[2] مولانا عبد الحئی: نزہتہ الخواطر ۲۰۳/۶

[3] ڈاکٹر جمیل احمد: حرکتہ التالیف باللغتہ العربیہ فی الاقالیم الشمالی الھندی ص ۱۳۲، مطبوعہ وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، دمشق، ۱۹۷۷ء؛

الدیوان الخامس[1] والدیوان السادس والسابع: ۱۱۹۳ھ [یہ بھی غالباً سال تالیف ہے]

الدیوان الثامن[2]: اس دیوان کا مخطوطہ کتابخانہ مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ اس کی تاریخ ۱۰۹۰ھ بتائی گئی ہے جو صحیح نہیں ہے، ۵۵ ورق۔

الدیوان التاسع[3] معروف بہ "تحفتہ الثقلین": مطبع نور الانوار، آرہ (بہار) سے ۱۲۹۴ھ میں شایع ہوا۔ اس دیوان کا مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کتابخانہ مولانا آزاد میں موجود ہے نمبر ۱۱۷ ع ۸۹۲/۲۹۸ ع/1۔

الدیوان العاشر: دیوان نہم اور دہم کے نسخے ذخیرۂ سبحان اللہ علی گڑھ میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دیوان آزاد کے کچھ نسخے درج ذیل کتب خانوں میں بھی ملتے ہیں۔

- حیدر آباد، کتابخانۂ آصفیہ، شمارہ ۱۰۹
- رام پور، کتابخانۂ رضا، شمارہ ۹۷، نستعلیق، ۲۹۸ ورق، بہ نام دیوان آزاد، در اول شرح قصیدۂ نونیہ، ناقص الطرفین[4]
- پٹنہ، کتابخانہ خدابخش، شمارہ ۳۳۷۰، نستعلیق، ۱۲ویں صدی، ۲۰۰ ورق[5]
- پٹنہ، کتابخانہ خدابخش، شمارہ ۳۹۵۹، نسخ، ۱۱۷۰ھ، ۵۶ ورق، بہ نام

---

[1] حوالۂ سابق حرکتہ التالیف الخ [2] نسخہ ہائے خطی دفتر پنجم دانشگاہ تہران ص ۲۰۹۴؛ معارف اعظم گڑھ ج ۱۸ ص ۳۳۹ [3] ڈاکٹر جمیل احمد: حرکتہ التالیف باللغتہ العربیہ... ص ۱۳۲، نیز رجوع کریں: زبید احمد ص ۲۸۴ و مقدمۂ سبحۃ المرجان از فضل الرحمن ندوی ص ۱۱ (بزبان انگریزی) [4] فہرست کتب عربی موجودہ کتبخانہ ریاست رامپور (رضا) جلد اول ص ۵۸۶ مطبوعہ رامپور مئی ۱۹۰۲ء [5] مفتاح الکنوز ۱۲۹/۳۔

" دیوان و قصائد غلام علی آزاد بلگرامی"، ورق آخر بخط آزاد[1]

- ایران، تہران، کتابخانہ مرکزی دانشگاہ تہران، شمارہ ۷۵۰۳-۱ (فہرست نشدہ)
- لندن، برٹش میوزیم، شمارہ ۸۲۶۹ OR (فہرست نشدہ)

۷۔ تسلیۃ الفواد فی قصاید الآزاد | یہ آزاد کے چند قصاید کا مجموعہ ہے۔ اس کا مخطوطہ کتابخانہ عارف حکمت مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ [رجوع کریں؛ زبید احمد ص ۲۴۹]

۸۔ مرآۃ الجمال | ایک سو پانچ اشعار پر مشتمل ایک عربی نظم ہے جس میں آزاد نے معشوق کے سراپا کی خوبیوں کا بیان کیا ہے۔ انہوں نے یہ نظم ۱۱۸۰ھ/۷۷-۱۷۶۶ء میں کہی۔ اسٹوری نے بھی اس نظم کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس نے آزاد کی ایک فارسی مثنوی کو جس کا عنوان 'سراپائے معشوق' ہے اور اس میں بھی آزاد نے معشوق کے سراپا کی تعریف بیان کی ہے اور مرآۃ الجمال کو ایک ہی سمجھا ہے[2] جبکہ یہ دو الگ زبانوں میں ہیں۔

واضح رہے کہ مولانا باقر آگاہ مدراسی (۱۱۵۸-۱۲۲۰ھ)[3] نے بھی مرآۃ الجمال کے نام سے سراپائے معشوق کی تعریف میں ایک مثنوی ۱۱۰۵ اشعار کی کہی تھی اور اسے آزاد بلگرامی کو بھیجا تھا۔ آزاد نے اس پر اظہار رائے کیا تھا۔ یہ مثنوی دیوان آگاہ کے ساتھ شامل ہے اور اس کا نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے نمبر ۲۸۶-258 M.۳۰ N/۸ ہے۔

---

[1] مفتاح الکنوز ۱۲۹/۳ [2] اسٹوری: جلد اول حصہ دوم ص ۸۶۲؛ زبید احمد نے تفصیل سے اس مثنوی کے محاسن بیان کیے ہیں ص ۲۵۰-۲۵۴؛ برائے نسخہ ہای خطی رک بہ: فہرست کتابخانہ خدا بخش ۱۵۰/۲۳ و علی گڑھ ذخیرہ احسن مارہروی [3] برائے شرح احوال آگاہ رک بہ: نتائج الافکار ص ۹۳-۹۴؛ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۹؛ لغتنامۂ دھخدا "آگاہ" ص ۱۴۹؛ شمع انجمن ص ۶۹ و مولانا باقر آگاہ از علیم صبا نویدی (اردو)

۹۔ کشکول | مختلف مضامین پر مشتمل اس کشکول کا قلمی نسخہ کتابخانہ آصفیہ حیدرآباد میں بعنوان محاضرات عربی موجود ہے۔ اکثر بخط مولف ہے۔[1]

۱۰۔ الامثلۃ المترشحۃ من القریحہ | اس کا ذکر معجم المولفین جلد ۷، ص ۳۲-۳۳؛ ایضاح المکنون جلد ۱ ص ۱۲۶-۴۸۳؛ ھدایۃ العارفین جلد ۱ ص ۷۷، اور فہرست دار الکتب المصریہ جلد ۳ ص ۱۸۱ و جلد ۵ ص ۲۱۴ پر آزاد کی تالیف کے طور پر آیا ہے

۱۱۔ قصیدۂ ہمزائیہ | اس کا مخطوطہ کتابخانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں موجود ہے شمارہ ۱۴۹۶، نسخ، ص ۴[2]

۱۲۔ اوج الصبا فی مدح المصطفیٰ[3] | حضرت پیغمبر اکرمؐ (ص) کی مدح میں اس قصیدے کا مخطوطہ کتابخانہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں ہے۔ شمارہ ۱۴۲۳، نستعلیق ۹۶ ص۔

۱۳۔ نصاب القصیدہ فی التغزل | اس کا ذکر ڈاکٹر جمیل احمد نے اپنی کتاب حرکۃ التالیف باللغۃ العربیۃ ... ص ۱۳۵ پر کیا ہے۔

۱۴۔ مکتوبات حضرت مجدد | آزاد نے شیخ مجدد سرہندی کے بعض خطوط کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ذکر حیات جلیل جلد دوم ص ۱۷۵ پر ملتا ہے[4]

---

[1] فہرست آصفیہ ۴۹۴/۲ [2] فہرست ندوہ ۶۲۲/۳ [3] ایضاً ۶۳۸/۳ [4] مقبول احمد صمدانی: حیات جلیل مطبوعہ الہ آباد ۱۹۲۹ء (اردو) دو جلد دریک مجلد۔

اخبار علمیہ

گذشتہ دو دہائیوں سے بنگلور کے مولانا شہاب الدین ندوی قرآن مجید اور سائنس کے موضوع پر عمدہ، مفید اور پُر از معلومات مقالات و مضامین لکھنے میں مصروف ہیں، ان کی تصنیفات کی تعداد بھی کم نہیں، ان کے دائرۂ تحریر میں بعض فقہی اور معاشرتی مسائل مثلاً زکوٰۃ، بیع مرابحہ، اسلامی بینک کاری، نکاح، طلاق اور تعدد ازدواج وغیرہ بھی شامل ہیں لیکن ان کا اصل کارنامہ قرآن مجید کے پس منظر میں بعض جدید سائنسی تحقیقات و خیالات کا مطالعہ و تجزیہ ہے، نباتات، نظریۂ ارتقا، تسخیر کائنات فطرت اور کلوننگ پر ان کی تحریریں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، انہوں نے بنگلور میں خاص ان مقاصد کے پیش نظر ۱۹۸۰ء میں فرقانیہ اکیڈمی قائم کی تھی جس نے خاصی ترقی کرلی ہے، اسکے کتب خانہ میں تیس ہزار سے زیادہ کتابیں جمع ہو چکی ہیں، اکیڈمی کے رفقا بھی ہیں جو تحقیق و ترجمہ میں منہمک ہیں، حال ہی میں اکیڈمی کی جانب سے متعدد کتابیں اور رسالے موصول ہوئے، ان میں قرآن اور نظام فطرت، قرآن عظیم کا نیا معجزہ، سائنسی میدان میں مسلمانوں کا عروج و زوال، خلافت ارض کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت، اسلامی نکاح، جہیز ایک سماجی فتنہ اور تعلیم نسواں وغیرہ شامل ہیں، مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ ان میں متعدد کتابوں کے ترجمے عربی اور انگریزی میں ہو چکے ہیں، انگریزی مطبوعات کا مقصد غیر مسلموں اور غیر اردو داں طبقہ میں اسلامی علوم و نظریات کی تبلیغ ہے، غیر مسلموں میں

ان کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے، اس کے لیے اکیڈمی کو اعلیٰ تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے پتے مطلوب ہیں، قارئین معارف سے بھی تعاون کی درخواست ہے، پتہ یہ ہے:

فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، 82 FIRST STAGE B T.M IST CROSS 10TH MAIN

بنگلور 560029 -

پاکستان کے ادارہ مقتدرہ قومی زبان کی خدمات کا ذکر ان صفحات میں برابر کیا جاتا ہے، عرصہ ہوا اس نے اپنی چند مطبوعات کا ایک سٹ بطور تحفہ دارالمصنفین کو پیش کیا تھا، ان مطبوعات کی خوبی یہ ہے کہ یہ اردو زبان و ادب کے بعض جدید مسائل سے متعلق ہیں، مثلاً سائنسی علامات ترقیمات اور ہندسے، زیر ملازمت ٹائپ کاروں اور مختصر نویسوں کے رجحانات، سفارشات املا و رموز اوقاف، اردو زود نویسی کا ارتقا، بعض کتابیں دراصل سروے رپورٹ ہیں لیکن یہ حد درجہ مفید معلومات پر مشتمل ہیں جیسے انگریزی ذریعہ تعلیم کے پرائیوٹ ادارے، عوامی نمائندے اور قومی زبان، اسلام آباد کی خواتین اور قومی زبان، قومی زبان اور خواتین میں عادات مطالعہ، ان نسبتاً مختصر الحجم کتابوں کی اہمیت کا اندازہ مطالعہ سے ہی کیا جا سکتا ہے، اردو زود نویسی کے موضوع پر اردو میں ایک دو نامکمل کتابوں یا چند مضامین کے علاوہ کچھ اور نہیں لکھا گیا، مقتدرہ کی کتاب میں اس کی جامع تاریخ کے علاوہ نفس موضوع پر ایسا مواد فراہم کر دیا گیا ہے جو اس شعبہ سے وابستہ افراد کے لیے بڑا کارآمد ہے، املا و رموز اوقاف کی سفارشات بھی محنت اور سلیقہ سے پیش کی گئی ہیں اور الف مقصورہ، الف لام اور عربی مرکبات نون غنہ، تنوین، ہائے مخلوط اور واؤ وغیرہ الفاظ کے متفقہ املا کی جانب رہنمائی کی گئی ہے جس سے املائی انتشار کی ناگوار صورت حال کے ختم ہونے میں یقیناً مدد

ملے گی، سروے رپورٹیں بھی بڑی دلچسپ ہیں، خصوصاً پاکستان کے لسانی پس منظر میں عوامی اداروں میں اردو کے اثر و نفوذ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، مقتدرہ قومی زبان کی یہ مساعی یقیناً قابلِ قدر اور لائق تحسین و آفرین ہیں، ہم اس تحفہ کے لیے بھی مشکور ہیں۔

حال ہی میں سعودی عرب کی وزارت شئون اسلامیہ کے ادارہ مرکز البحوث والدراسات الاسلامیہ کا جدید علمی مجلہ "دراسات اسلامیہ" موصول ہوا، مرکز البحوث چند سال پہلے ریاض میں قائم ہوا تھا، اس کے مقاصد میں علمی و تحقیقی مضامین کے ذریعہ اسلام کے پیغام کی اشاعت، دوسرے فرق و مذاہب اور ہم عصر فکری تحریکوں کا تجزیہ، عالمی سطح پر مسلم معاشرہ کی پیش رفت کا جائزہ وغیرہ موضوعات شامل تھے، اب ان مقاصد کی عملی شکل زیر نظر شمارہ کے قالب میں موجود ہے، یہ اولین شمارہ قریب تین سو صفحات میں افتتاحیہ، بحث و دراسات، تقریر و ندوات اور عروض و مراجعات کے ابواب میں منقسم ہے، مضامین میں مستشرقین کے مغالطات، سودان کے ایک علاقہ میں عیسائی مشنریوں کا فتنہ اور ازبکستان کے مسلمان کے علاوہ الامامۃ فی الصلوٰۃ وسیلۃ من وسائل الدعوۃ الی اللہ کے عنوان سے مفصل مقالہ بھی ہے ایک اور مضمون سحر اور جن کے موضوع پر ہے، مطبوعات جدیدہ پر انتقاد و تقریظ کا گوشہ زیادہ جاذب نظر آیا، اس میں چار اہم کتابوں پر تبصرے شامل ہیں، طباعت اور کاغذ کی عمدگی توقع کے مطابق ہے، مجلہ کی مجلس علمی اور ادارۂ تحریر میں دوسرے فضلائے عرب کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح اور ندوہ کے فاضل ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی کا نام ہمارے لیے باعثِ فخر و مسرت ہے۔

ع ۔ ص ۔

معارف کی ڈاک

سنسکرت زبان کی لغوی برتری

کھیری لکھیم پور
۴ر اگست ۹۸ء

مکرمی ! السلام علیکم۔

ماہنامہ "معارف" جولائی میں جناب گوردیال سنگھ مجذوب کا ایک مضمون بہ عنوان بالا شایع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی تمام دوسری زبانیں سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔

آیئے ذرا اس مضمون مجذوب کا سرسری جائزہ لیں اور دیکھیں یہ جناب موصوف کا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔ (خط کشیدہ الفاظ غور طلب ہیں) فرماتے ہیں :

"کہا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام حام اور دوسرے کا سام تھا چنانچہ دنیا بھر کی تمام زبانیں انہیں کے نام پر سامی اور حامی زبانوں کے نام سے موسوم ہوئیں"

اس سلسلہ میں خاکسار راقم سطور نہایت ادب سے عرض کرتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے پانچ بیٹے تھے۔

۱۔ سام : جسے پدر عرب کہا جاتا ہے۔

۲۔ یافث : جسے پدر روم کہا جاتا ہے۔

۳۔ حام : جسے پدرِ حبش کہا جاتا ہے۔

۴۔ کنعان : یہ طوفان نوحؑ میں ہلاک ہوگیا تھا۔

۵۔ عابر : اس کا طوفان سے پہلے انتقال ہوچکا تھا۔

تاریخ دانوں نے ایک بیٹے کا اور نام لکھا ہے، یوناطر

بہرحال تولید وتناسل کا سلسلہ سام، یافث اور حام سے شروع ہوا۔

مجذوب صاحب سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"۔۔۔۔ سامی زبانوں میں عربی اور عبرانی زبانیں آتی ہیں جو مشرق وسطیٰ کے ممالک میں ۔۔۔۔ مروج ہیں، یہ زبانیں دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں اگرچہ فارسی، پشتو اور سندھی وغیرہ جیسی چند اور زبانیں بھی دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہیں تاہم ان زبانوں کا بھی ماخذ سنسکرت ہے مگر بعد میں سیاسی اقتدار اور سامی زبانوں کے غلبہ کی وجہ سے یہ بھی دائیں سے بائیں جانب لکھی جانے لگیں۔"

حضرت مجذوب کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ پہلے فرمایا کہ "فارسی، پشتو وغیرہ دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہیں" اور پھر اسی بات کو دہراتے ہیں کہ سیاسی اقتدار اور سامی زبانوں کے غلبہ سے یہ بھی دائیں سے بائیں جانب لکھی جانے لگیں۔ غالباً مجذوب صاحب کی تحقیق یہ ہوگی کہ پہلے پشتو، فارسی، سندھی وغیرہ بائیں سے دائیں طرف لکھی جاتی تھیں اور بعد میں غلبہ متذکرہ بالا کی وجہ سے دائیں سے بائیں جانب لکھی جانے لگیں۔

اب اس کی توضیح صرف مجذوب صاحب ہی کرسکتے ہیں۔

ہاں ایک بات اور توضیح طلب ہے کہ حضرت نوحؑ کی زبان کیا تھی اور ان کے بیٹوں "حام اور سام" کی زبانیں" کیا تھیں! میرے خیال میں حضرت نوحؑ نے سام کی

پرورش کی اور ان کو سکھایا پڑھایا اور حضرتؑ کی بیوی نے حام کو سکھایا پڑھایا، میاں بیوی دونوں کی زبانیں علیحدہ علیحدہ ہوں گی۔ مجذوب صاحب ہی اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں۔

خیر آگے چلئے کہتے ہیں:

"چونکہ سنسکرت زبان علمی و دینی ہونے کے باوجود سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں بعد میں رواج نہ پاسکی اور یہ زبان مردہ ہوکر رہ گئی۔"

یعنی مسلمانوں کی آمد کے بعد سے یہ زبان مردہ ہوگئی۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ زبان زندہ کب تھی۔ زندہ زبان وہ ہوتی ہے جو ہر کہ ومہ بولے۔ سنسکرت صرف پنڈتوں کی زبان تھی جو اسے اتر سے بولتے ہوئے ہندوستان آئے تھے اور یہاں قبضہ کرکے یہاں کے باشندوں کو شودرا اور چنڈال بنا ڈالا۔ ان کے کان میں بھی اگر سنسکرت کا کوئی لفظ پڑجاتا تھا تو اس کے کان میں سیسہ گرم کرکے ڈال دیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں پنڈتوں کا غلبہ تھا زبان کیوں نہیں عام ہوئی۔

اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے ہم کو لفظ سنسکرت کے معنی ومطلب پر غور کرنا چاہیے۔ یہ لفظ ہندی مصدر سنس کرنتر (संस करना) سے بنا ہے اور اس کا اسم مفعول ہے۔ سنسکرنتر کے معنی ہیں صاف کرنا، شدھ کرنا اور سنسکرت کے معنی ہیں صاف کیا ہوا اور شدھ۔ ظاہر ہے جو چیز صاف اور شدھ نہ ہوگی وہی صاف اور شدھ کی جائے گی۔ ہندوستان میں یہ سورن جات (स्वर्ण जाति) جب آئے تو وہی بولیاں بول رہے تھے جو وہ ایران وغیرہ سے (جہاں وہ رہ رہے تھے) لائے۔ یہاں یعنی ہندوستان میں جو بولیاں بولی جارہی تھیں یعنی دراویدی بولیاں پالی وغیرہ انہیں

ان لوگوں کو اپنی بولی (زبان) میں شامل کرنا پڑا اور اس طرح سنسکرت شدہ ہوکر ایک اعلیٰ زبان بن گئی اور ظاہر ہے کہ اس میں برسوں لگے ہوں گے۔

مسلمانوں نے اس زبان کی انتہائی قدر کی۔ ملک محمد جائسی، خان خاناں، اسکھان وغیرہ اس کے زبردست عالم تھے۔ شہنشاہِ ہند جہانگیر کا لڑکا دارا شکوہ تو اس زبان کا اتنا والہ وشیدا ہوا کہ وہ ہندو بن کر ایک بہت بڑے پنڈت کا شاگرد ہوگیا اور اس نے اعلیٰ ترین سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ مسلمانوں نے سنسکرت وغیرہ کے ساتھ کبھی کوئی تعصب نہیں برتا۔

موصوف کا یہ دعویٰ بھی محلِ نظر ہے کہ سنسکرت "معلوماتی اعتبار سے تمام دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہے اور موجودہ سائنسدانوں نے اس زبان کے مقدس صحائف اور ویدوں سے بھی روشنی حاصل کرکے اپنی تحقیق کو آگے بڑھایا"۔ اس دعویٰ کی دلیل میں حضرت موصوف نے کوئی مثال پیش نہیں کی۔ ہاں مسلمانوں سے البتہ انہوں نے روشنی حاصل کی۔ رسالہ "البرق" (ELECTRICITY) اس کا گواہ ہے اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو مغرب نے مسلمانوں سے سیکھیں۔ یہاں ان کا ذکر بیکار مضمون کو طویل کرنا ہے، تاریخیں اس بیان سے بھری پڑی ہیں اور فاضل مضمون نگار کی نگاہوں سے ضرور گزری ہوں گی۔

جہانتک ویدوں اور دوسرے مقدس صحیفوں کا سوال ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

یہ طے ہے اور تمام مستند تاریخی کتابیں اس کی گواہ ہیں کہ یہ اونچی ذات والے ایران وغیرہ سے آئے اور ہندوستان کے اصلی باشندوں کو غلام بنا کر یہاں حکومت

کرنے لگے۔ یہ ایرین اپنے آپ کو کہتے ہیں۔ یعنی آریہ! CONTINUED۔

اس سلسلہ میں ابو رحمت کی کتاب "تھذیب المکذبین" مصنفہ مولوی ابو رحمت حسن کے صفحہ ۸۸ کا ایک اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ قریب ستّر برس پرانی کتاب ہے۔ میرے پاس ہے۔ شروع کے ورق غائب ہیں۔ مطبع کا پتہ نہیں لیکن آخر میں قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۱۳۱۲ھ مطابق سنہ ۱۹۰۹ء میں منصۂ شہود پر آئی۔

"..... ایرین لفظ پرانی زندی میں بھی ایرنیہ کرکے آیا ہے ..... وہ ایرج بن فریدون سے منسوب ہے اور یہ نسبت سنسکرت میں بھی موجود ہے۔ جیسا کہ نار این پانی میں رہنے والا۔ پس جو لوگ ابن فریدون سے نسبت رکھتے ہیں وہی ایرین یا ایرجن ہیں اور ویدون کے مصنف ہیں"۔

اسی کتاب کے صفحہ ۹۴ سے ۹۸ تک مصنف نے ایران کی مذہبی کتب "اور مزدیشت، خورشید نیایش بن وغیرہ سے آیتیں پیش کرکے اور ان کا جس طرح سے ویدوں میں ذکر کیا ہے بیان کیا ہے" اس کی صرف ایک مثال پیش کر رہا ہوں:

اورمزدیشت آیۃ ۵۸ :-

نمو ایرنیہ ویجہ۔ ایران کو نستے یجہ کو نستے۔

کم وبیش یہی مضمون یجروید ادھیائے ۲، منتر ۱، ۲، ۳ میں ہے، یہ سب تھذیب المکذبین میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ دساتیر میں ہے کہ :-

" اکنون برہمنے بیاس نام از ہند آید بس دانا کہ برزمین کم کس چناں است۔

چوں ایں مایہ برد خوانی راست کیش شود واز ہم آئینان تو گردد۔"

اس کی تشریح میں آگے لکھا ہے :۔

"گویند چوں بیاس ہندی بہ بلخ رسید، گشتاسپ بادشاہ زرتشت را بخواند و در آمدن آں دانا گفت۔ دخشور پاسخ داد کہ یزدان آسمان کند۔ پس شہنشاہ فرمود تا از ہر کشورے فرزانگان موبدان را بخوانند۔ چوں ہمہ گرد آمدند زرتشت از آفرین خانہ برآمد و بیاس نیز بہ انجمن آمدہ۔ دخشور گفت اے زرتشت از پاسخ دراز گزاری شنکر جی جہانیان آہنگ کیش تو دارند و جزیں فردیہائے بسیار شنیدہ ام۔ من مردے ہستم ہندی نژاد و بہ دانش بے نظیر۔ راز سربستہ دارم کہ از دل بہ زبان نیاوردہ ام۔ اگرچہ گروہے گویند کہ اہرمناں بہ اہرمن کیشاں دیو پرستاں آگہی می دہند و جز از دل من ہیچ گوش نشنیدہ کرد۔ دریں انجمن ازاں رازہا یک برمن خوانی بہ آئین تو آیم۔ زرتشت گفت پیش از آمدن تو اے بیاس یزداں ازاں رازہا بہ مرا آگہی بخشیدہ پس ایں دریم را از آغاز تا انجام برو خواند۔ چوں بشنید و چم پرسید بہ مغز رسید، یزداں را نماز برد و بہ آئین در آمدہ و بہ ہند باز گشت۔" (نامہ دخشور زرتشت مطبوعہ ایران، صفحہ ۱۲۶ تا ۱۵۸ بہ حوالہ تہذیب المکذبین صفحہ ۲۶)

یہی حال شنکر جی کا ہوا۔ ملاحظہ ہو :

"شنکر دانائے بفرزانگی و زیر شناختہ شدہ و موبدان بہ شاگردی رومی نائیدند چون سخن از دخشور زرتشت شنید بر آہنگ بر انداختن یر، یا ایران آمد۔ چوں بہ بلخ رسید بے آنکہ از زبان سخنے بیروں دہد و پرسشہا کند

زرتشت بہ او گفت ہرچہ در دل داری بہ زبان مسپار و راز دار۔ بس بفرزانہ شاگرد گفت یک نسک او ستا برو خواں۔ دریں خجستہ نسک سراسر پژوہشہائے شنکر بود با پاسخہا کہ پیغبر خود یزداں می گوید کہ چنیں کسے آید بہ چنیں نام و نخستیں پرسش او ایں است و پاسخ او چنیں۔ چوں شنکر چنیں فزجوئی دید بآئین شد و بہ ہند باز گشت و دریں فرخندہ کیش استوار ماند۔" دسفرنگ دساتیر مطبوعہ ایران صفحہ ۱۳۵ بہ حوالہ تہذیب المکذبین صفحہ ۲۷)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ویدوں کی زبان اور تعلیم زردشتی مذہب اور زبان کی مرہون منت ہے۔

اوپر جو فارسی اقتباسات دیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے :

"ہندوستان سے ایک نہایت قابل برہمن بیاس جی شہنشاہ گشتاسپ کے زمانہ میں بلخ آیا۔ بادشاہ نے کشور ایران سے تمام دانشوروں اور زرتشت کو بلایا۔ مجلس برپا ہوئی۔ بیاس نے کہا اے زرتشت میرے دل میں کچھ باتیں ہیں اگر تو انہیں بتادے تو میں تیرا دین اختیار کرلوں گا، زرتشت نے سب کچھ بتا دیا۔ بیاس زرتشتی ہوگیا۔ یہی حال شنکر جی کا ہوا۔ زرتشت نے بغیر پوچھے ہوئے اس کا نام وغیرہ ہر چیز جو اس کے دل میں تھی بتادی۔ وہ بھی زرتشتی ہوگیا۔"

واضح رہے کہ یہ وہی بادشاہ گشتاسپ ہے جو چار ہزار سال قبل مسیح ہندوستان پر حملہ کرکے بہت سے حصہ پر قابض ہوگیا۔ بیاس جی اور شنکر جی زرتشتی تعلیم حاصل کرکے ہندوستان آگئے اور ویدوں وغیرہ کی رچنا کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وید قریب پانچ ہزار برس پہلے تدوین ہوئے تھے۔ اس لیے ان میں بہ کثرت فارسی اور ژندی الفاظ ہیں۔

مشتے نمونہ از خروارے کچھ الفاظ پیش ہیں :

	زندی فارسی الفاظ	وید کے الفاظ	معنی
۱	آب	آپ	پانی
۲	باشش	داس	رہنا
۳	پییت	پریت	محبت
۴	تن	تنو	بدن
۵	جودن	یودن	جوانی
۶	خر	کھر	گدھا
۷	داتا	داتا	دینے والا
۸	داس	داس	غلام
۹	دوش	دوش	کندھا
۱۰	دوازدہ	دوادشہ	بارہ

وغیرہ ہزاروں فارسی الفاظ ہیں جن سے وید بھرے پڑے ہیں۔ اس لیے مجذوب صاحب کا یہ دعویٰ کہ سنسکرت لغویاتی طور پر برتر ہے۔

جناب موصوف کا پورا مضمون اسی طرح کی بوقلمونیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان کی قابلیت اور ہمہ دانی میں کوئی شک نہیں پھر بھی بہتر ہوتا کہ متعلقہ کتابوں پر ایک نظر ڈال لیتے تو وہ اس مضمون کے لکھنے کی زحمت سے بچ جاتے۔

مضمون طویل ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے مجبوراً اسے ختم کر رہا ہوں، اس شعر پر

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار — گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

عزمی خیرآبادی، ۴ اگست ۹۸ء

مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق کتاب پر ایک تاثر

"مولانا ابوالکلام آزاد پر راقم کی جو کتاب اس سال آزاد کی گولڈن جبلی کی تقریب کی مناسبت سے مولانا کی وفات کے مہینے (فروری ۹۸ء) میں شایع ہوئی ہے، الحمدللہ اس کی پذیرائی ہورہی ہے، آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اردو سروس اور بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے اس پر دو حضرات کی تقریریں نشر ہوچکی ہیں، یہ مکتوب گرامی بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو ہندو پاک میں مولانا کے سب سے بڑے عارف، محقق اور شیدائی کے تاثرات پر مشتمل ہے"۔ (ض)

مکرم بندہ محترم اصلاحی صاحب!

کتاب کے تحفے کے لیے شکرگزار ہوں۔ اس کے بارے میں چند سطریں لکھ دی ہیں پسند ہوں تو جس طرح، جہاں چاہیں استعمال کرلیں۔ آپ نے "پیام" کا تذکرہ میرے ایک حوالے پر ختم کیا ہے۔ لیکن میں نے "آزاد کی صحافت" میں اس کا تذکرہ حضرت سید صاحب کے پیام پر تبصرے (معارف فروری ۱۹۳۰ء) پر ختم کیا ہے۔ ایک الگ پیکٹ میں تین کتابیں دوستوں کی ہیں، ان پر چند سطریں معارف میں لکھ دیجئے گا۔ کیا پاکستان میں کوئی صاحب ایسے ہیں جنھیں دارالمصنفین کی مطبوعات کے لیے رقم بھجوادی جائے؟

مولانا آزاد فکر و سیرت، علم و عمل اور ذہنی و دماغی جہات سے متنوع خصائص کی ایک جامع شخصیت تھے۔ لیکن مذہب، صحافت اور سیاست ان کی علمی و عملی زندگی کے بہت نمایاں پہلو تھے۔ محترم ضیاء الدین اصلاحی کی یہ کتاب مولانا کی شخصیت کے انہی تین پہلوؤں کے خصائص و خدمات کی جامع و شارح ہے۔

ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے ان کی شہرت بھی صحافی و مدبر کی طرح ہے، لیکن

وہ اپنی صحافت و سیاست اور مذہب سے الگ محض ادیب اور انشا پرداز نہیں تھے۔ ادب و انشا ان کی صحافتی، مذہبی، سیاسی، تاریخی تحریروں کی ایک مزید اور نمایاں خوبی تھی۔ اس لیے جہاں ان کی کسی قسم کی تحریرات کا تذکرہ آتا ہے، ان کی تحریر و نگارش کی ان خوبیوں کا ذکر بھی ضرور آتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی الہلال کے تذکرے میں اس کی مذہبی و سیاسی اور قومی مقدمات کے ضمن میں اس کی دعوت، زبان و بیان، اسلوب تحریر اور علمی و ادبی خصائص و خدمات پر بھی تبصرہ موجود ہے۔

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اپنے دائرہ بحث و نظر میں یہ ایک جامع کتاب ہے اور اس کے ہر مضمون اور ہر صفحہ و سطر سے مصنف کے وسیع مطالعے، ذوق تالیف و تدوین اور اسلوب تحریر و نگارش کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن مصنف کے ذوق علمی کا واقعی اظہار مولانا کے مذہبی افکار اور صحافتی خدمات کے تذکرے میں ہوا ہے۔ سیاسی افکار و خدمات میں ایک خاص حد تک ان کے ذوق نے رہنمائی کی ہے۔ مذہبی افکار میں ترجمان القرآن کے اہم مباحث کا نہایت سلیقہ و شائستگی کے ساتھ شگفتہ اسلوب بیان میں جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ اس کے خصائص کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے۔

بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی و عملی زندگی کے اہم پہلوؤں پر یہ ایک جامع تصنیف ہے۔ یہ بات بھی اس کی خصوصیات میں شمار کی جائے گی کہ اس میں مولانا سے متعلق خود مصنف کے تمام افادات و تحقیقات مرتب ہو گئے ہیں اور یہ کتاب دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

خاکسار

ابو سلمان شاہجہانپوری

ادبیات

غزل

از جناب اقبال ردولوی

اہلِ جنون کو اہلِ خرد کی ہوا لگی | میں سوچتا ہوں کون کہے گا خدا لگی
تنگ آ گئے تھے صرصرِ دوراں کی آگ سے | کوچے میں تیرے پہنچے تو ٹھنڈی ہوا لگی
تم اور اہلِ درد پہ یوں مہرباں ہو | شاید کسی فقیر کی تم کو دعا لگی
کس کی نگاہِ ناز کے مارے ہوئے ہیں لوگ | خلقت تمہارے شہر کی درد آشنا لگی
وہ خوف وہ ہراس تھا بس کچھ نہ پوچھیے | مقتل کی طرح شہر کی ہم کو فضا لگی
تیری صدا سُنی تھی زمانہ گزر گیا | پھر اس کے بعد تیری صدا ہر صدا لگی
ایسے بھی لمحے آئے ہیں اقبالؔ زیست میں | عمرِ عزیز بھی ہمیں جیسے سزا لگی

غزل

از جناب رئیس نعمانی، علی گڑھ

جب ہر اک سلسلۂ مہر و وفا ٹوٹے گا | کیوں نہ اس شہر پہ پھر قہرِ خدا ٹوٹے گا
کب تک احساس کے در بند رہیں گے اے دوست | اک نہ اک دن تو ترا قفلِ صدا ٹوٹے گا
کیا خبر تھی کہ جہاں وقتِ اجابت آیا | غم نصیبوں کا وہیں دستِ دعا ٹوٹے گا
شیشۂ دل کی امانت ہے تری، یہ بھی سوچ | سنگِ انکار سے ظالم ترے کیا ٹوٹے گا
سرگراں اتنی ہے کیوں موجِ صبا، اہلِ چمن | کس کا گلدستۂ گیسوئے دوتا ٹوٹے گا
تیرہ بختوں کی طرف چشمِ حقارت سے نہ دیکھ | ایک دن تیرا بھی ہر بندِ قبا ٹوٹے گا
نغمۂ زیست کا اول بھی ہے، آخر بھی سکوت | اک نہ اک روز ہر اک سحرِ نوا ٹوٹے گا
کیا مرے حال بھی فضلِ خدا ہو گا رئیسؔ | کیا کبھی حلقۂ زنجیرِ بلا ٹوٹے گا

مطبوعات جدیدہ

دیباچہ دیوان زادہ شاہ حاتم
از ڈاکٹر سراج الحق قریشی مرحوم،

قدرے بڑی تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: اکادمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، شارع سید الطاف علی بریلوی ا۔ جے ۱/۵/۳۴، ناظم آباد کراچی، پاکستان۔

شیخ ظہور الدین حاتم معروف بہ شاہ حاتم کا عہد اٹھارویں صدی کے اوائل کا ہے جو مغلیہ سلطنت کے زوال اور ہندوستان کے سیاسی انتشار کا زمانہ تھا، شاہ حاتم کی شاعری اردو کی ترقی پذیر شکل کے ساتھ ہی اس دور زوال کی بھی عکاس ہے، ولی دکنی کے بعد اور اردو کے طبقہ دوم کے شعراء میں وہ سرفہرست ہیں، سودا کے علاوہ بھی ان کے تلامذہ کا بڑا وسیع حلقہ ہے انکو اردو کا پہلا باقاعدہ صاحب دیوان شاعر کہا جاتا ہے، ان کے نایاب کلیات کا انتخاب دیباچہ دیوان زادہ بھی کم یاب تھا، اس کے صرف چار مستند نسخے محفوظ تھے، ان کی مدد سے فاضل محقق نے شاہ حاتم کے دواوین پر ولی دکنی کے اثرات ان کے شاعرانہ محاسن اور اردو کی ترقی کے لیے ان کی کاوشوں کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے، اصلاً یہ مرحوم کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے لیکن اس میں مزید تلاش و تحقیق کا کام وہ اپنی سن رسیدگی کے زمانے تک کرتے رہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ نصف صدی قبل تحقیقی مقالوں کا معیار کتنا بلند ہوتا تھا، انہوں نے میر تقی میر اور صاحب تذکرۃ الشعراء کریم الدین کے بعض غلط بیانات کی تصحیح بھی کی ہے، گو شاہ حاتم کے شہر آشوب کی مدافعت میں

انہوں نے کسی قدر جانبداری سے کام لیا ہے، تاہم نقائص کی نشاندہی میں چشم پوشی نہیں کی ہے، ایک جگہ شاہ حاتم کے اعتراف فضل وکمال کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ فحش وابتذال کی طرح انہوں نے سب سے پہلے ڈالی جو بعض اور ثقات کے ہاں فن کی شکل میں موجود ہے، ایک باب میں شاہ حاتم کے فارسی کلام کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، اصل دیباچہ دیوان زادہ کی طرح یہ مقالہ بھی عرصہ تک مفقود رہا، اس کی بازیافت و اشاعت میں جناب سید مصطفی علی بریلوی مدیر العلم کراچی کی مساعی کو بڑا دخل ہے، انہوں نے اسے شایع کرکے اردو شعر وادب کے ذخیرہ میں ایک قیمتی اضافہ کیا ہے۔

علمائے ہند کا سیاسی موقف
از مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم،

مدون: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد صفحات ۱۷۲، قیمت ۱۳۰ روپے، پتہ: مکتبہ رشیدیہ عائشہ منزل بالمقابل مقدس مسجد اردو بازار کراچی، پاکستان۔

فاضل مرتب ومدون نے ہند وپاک کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر متعدد کتابیں شایع کی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، یہ دراصل مولانا اکبر آبادی مرحوم کا ایک طویل مقالہ تھا اور رسالہ برہان دہلی میں ۱۹۴۸ء میں بالاقساط شایع ہوا تھا۔ اب فاضل مرتب نے تدوین وتبویب اور حواشی وتکملہ کے بعد اسے کتابی شکل میں شایع کیا ہے، انگریزوں کے خلاف علمائے ہند کی مقاومت کے مختلف دور اور علماء کی سیاسی حکمت عملی اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔ سید احمد شہید، مولانا قاسم نانوتوی، سرسید، علامہ شبلی، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا آزاد کی تحریکوں اور شخصیتوں کے وسیع پس منظر میں یہ بحث آج بھی اہم ہے، باب سیزدہم میں ایک مقام پر

نامکمل شکل میں مولانا اکبر آبادی کی عبارت تمام ہو جاتی ہے اس کے بعد دو ابواب فاضل مرتب کے قلم سے بطور تکملہ ہیں، حواشی میں فاضل محشی کا رنگ صاف جدا نظر آتا ہے ص ۱۲۱ کے ایک حاشیہ میں جمعیۃ العلماء سے اختلاف رکھنے والے بعض علمائے دیوبند کے متعلق سخت اور نامناسب لب ولہجہ اختیار کیا گیا اور یک طرفہ فیصلہ صادر کیا گیا ہے، تاہم برصغیر کی تاریخ جدوجہد آزادی کے متعلق یہ کتاب ایک اہم دستاویز اور قیمتی تحفہ ہے غالباً حمید انصاری غازی سہو کتابت کی غلطی ہے، صحیح مولانا حامد الانصاری غازی ہوگا۔

مغربی تہذیب، انحطاط اور علاج از مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت وطباعت مناسب، صفحات ۲۰۸، قیمت ۸۰ روپے، خصوصی تعاون ۲۰۰ روپے۔ پتہ: دار التصنیف والترجمہ، ۲۷۔ رفیقیہ اسکول روڈ، بھوپال، ایم۔ پی۔

دار التصنیف والترجمہ بھوپال کا مقصد آسان علمی اسلوب میں اسلامی عقاید و اعمال کی تشریح و تبلیغ ہے، اس سے پہلے فاضل مصنف کی دو اور کتابیں بھی یہاں سے شایع ہو چکی ہیں، زیر نظر کتاب میں انہوں نے اسلام اور مغربی تہذیب و تمدن کے بنیادی فرق کی وضاحت میں دہریت، جمہوریت، جارحانہ قوم پرستی، بے مہار آزادی، نسلی امتیاز اور جنسی بے سمتی وغیرہ موضوعات کا جائزہ لے کر اسلام کے نسخۂ شفا کی اہمیت بیان کی ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے اہل کتاب کی روایات و معتقدات ہی کو پیش نظر رکھا ہے۔ ایک اور باب میں مغربی تہذیب کے چند عبرت آموز نمونے بھی پیش کر دیے ہیں، مشہور عرب صاحب فکر و قلم مصطفیٰ سباعی کے ایک انٹرویو کا ترجمہ بھی مع حواشی درج ہے۔ فاضل مصنف وسیع المطالعہ، صاحب فکر اور مشاق اہل قلم ہیں، یہ کتاب

ان خصوصیات کی شاہد ہے، مطبوعات ادارہ کے حسب دستور اس کا انتساب بھی علامہ شبلی کے نام ہے۔

کلدیپ اختر شخصیت اور فن مرتبہ احباب اردو مجلس، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ، نفیس طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۸، قیمت درج نہیں، پتہ: احباب اردو مجلس، سی ۲/۱۶۲، جنک پوری، نئی دہلی۔

اس خوبصورت اور دلکش کتاب کے مصنف کو اردو کے دوسرے نمایاں ادیبوں کی طرح شہرت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن شاعری، انشائیہ اور ڈرامہ نگاری میں ان کے نقوش کی تابانی و درخشانی کم نہیں، جناب کلدیپ سنگھ رتہ، کلدیپ اختر اردو کے عاشق و فدائی تھے، ان کی شخصیت اردو تہذیب کے سانچے میں ڈھلی تھی، چند سال قبل ان کا انتقال ہوا تو ان کے بعض مخلصین نے ان کی منتخب غزلوں، انشائیوں اور ڈراموں کا یہ مجموعہ ان کی یاد میں شایع کیا، اس میں تین مضامین ان کی شخصیت پر بھی ہیں مگر یہ مختصر اور تشنہ ہیں، ابھی ان پر مزید لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ تین طویل ڈرامے نور جہاں، میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی کے کردار پر مبنی ہیں، ان کی شاعری کا رنگ بھی ملاحظہ ہو:

اس شوخ کی کیفیت چشم — در میخانہ کھلا ہو جیسے
اللہ اللہ یہ غرور آدم — خالق ارض و سما ہو جیسے

نایاب ہیں ہم از جناب آزادہ سلطانپوری، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت مجلد، صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: اردو تبیلہ F/5، پہلا منزلہ، رضوی باغ، ممبرا، تھانے ۴۰۰۶۱۲۔

عروس البلاد ممبئی کی آرائش وزیبائش میں اردو ادیبوں اور شاعروں کا حصہ اس درجہ ہے کہ اس باب الہند کا کوئی مورخ اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا، زیر نظر کتاب ایک فرد واحد کی ان یادوں کی داستان ہے جن کا تعلق ممبئی کے مشاعروں اور معاصر شعراء سے ہے، زبان کے حسن اور طرز بیان کی جدت نے ان چھوٹے چھوٹے خاکوں کو بہت پر لطف اور دلکش بنا دیا ہے، آدادہ مرحوم ان خاکوں میں اس طرح موجود ہیں کہ ہر چند کہیں نہیں مگر ہیں، اس جدید تذکرۂ شعراء کی ایک اور خوبی اسکے اس کے اشعار کا انتخاب ہے جو مرحوم خاکہ نگار کے پاکیزہ اور بلند ذوق کا غماز ہے، خود ان کی بعض غزلیں اور نظمیں بھی اس میں شامل ہیں جن سے ان کی جودت فکر و قدرت کلام ظاہر ہے، خاص طور پر ان کی نظم "ماں" بڑی موثر ہے، "مت سہل ہمیں جانو" کے بعد یہ کتاب دبستان ممبئی کی خاکہ نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

اظہار حقیقت میں تاخیر جرم ہے از مولوی محبوب عالم حزبی،

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت و طباعت، صفحات ۹۶، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: محبوب بکڈپو، قصبہ اتر ولیا، ضلع اعظم گڑھ۔ ۲۲۳۲۲۳

مصنف پہلے بریلوی مسلک کے پرجوش حامی تھے، اب انہوں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ زیر نظر رسالہ میں اس تبدیل مسلک کے وجوہ اسباب کا بیان ہے، ان کو اعتراف ہے کہ تحریر میں جا بجا تلخی آگئی ہے مگر اس سے کسی کی دلآزاری مقصود نہیں بلکہ اظہار حقیقت ہے۔

ع۔ ص۔